ماہنامہ

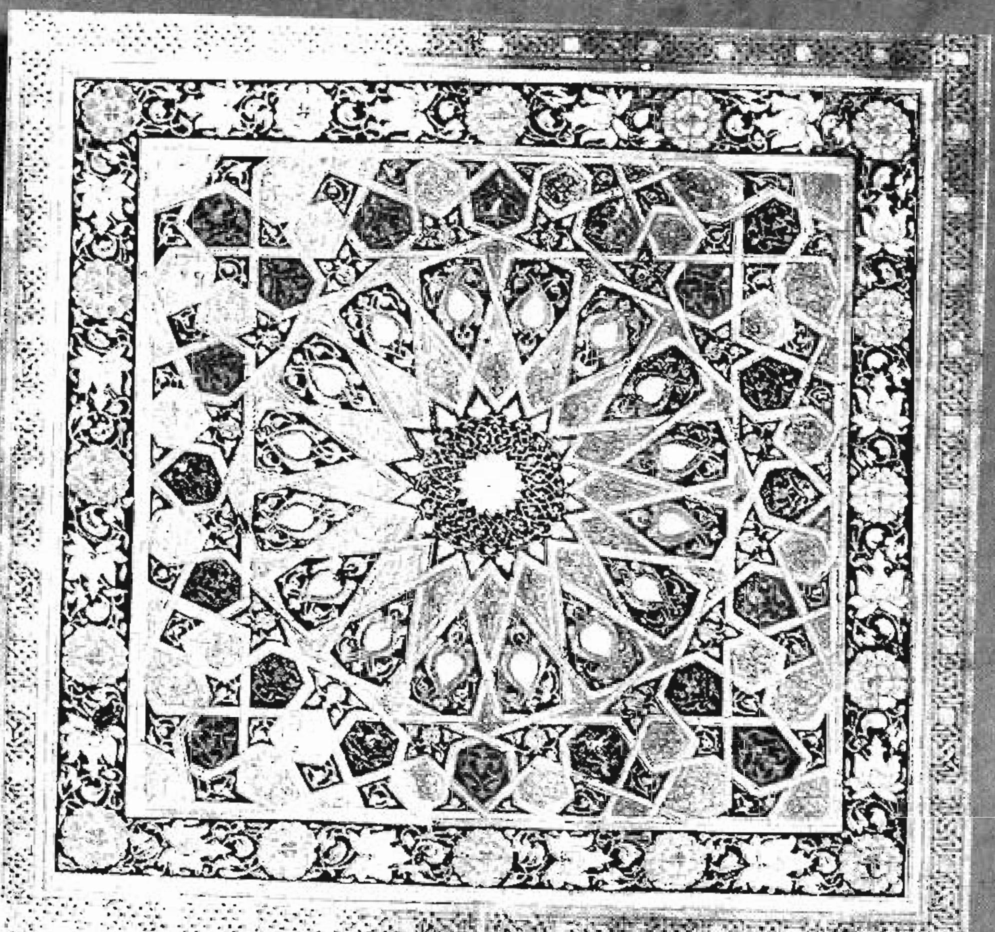
ترجمان القرآن

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مُدیر

خورشید احمد



ہاؤسنگ کی دُنیا میں قابلِ اعتماد نام احباب گروپ آف کمپنیز کی جانب سے ہاؤسنگ پراجیکٹس میں آٹھواں اور اسلام آباد زون 4 میں پہلا اور سب سے بڑا منصوبہ

احباب ایگرو فارمز

چند ایگرو فارمز باتیں ہیں

ایئرپورٹ سے 18 کلومیٹر، راول ڈیم سے 13 کلومیٹر اور اسلام آباد کلب سے صرف 14 کلومیٹر کے فاصلے پر سائٹ سے متصل بہنے والے نالے کی وجہ سے فارمنگ میں پانی کی قلت محسوس نہ ہوگی۔ نالے کے قریب سے 120 فٹ کی روڈ سائٹ کے فاصلے کو مزید 5 کلومیٹر کم کر دے گی۔

قیمت

20 کنال کا ایک فارم صرف 25 لاکھ روپے میں (ایک فارم دو افراد مل کر بھی لے سکتے ہیں) فی الحال 20 فارموں کا منصوبہ ہے جگہ خرید لی گئی ہے۔

طریقہ ادائیگی

بکنگ کے لیے 5 لاکھ روپے کا ڈرافٹ بنام "احباب ایگرو فارمز پرائیویٹ لمیٹڈ" یو بی ایل اکاؤنٹ نمبر 1694 ارسال فرمائیں بقایا رقم تین سال میں 12 سہ ماہی اقساط میں ادا کرنا ہوگی۔

خاص بات

بالآخر حکومت کو زون 4 کو رہائشی علاقہ قرار دینا پڑے گا۔ جس میں آج بھی خوبصورت مکانات بنائے جا رہے ہیں۔ آج کا 125000/= روپے کا کنال اُس وقت 20 تا 40 لاکھ روپے کنال ہو جائے گا اور آپ کو ایک ناقابلِ یقین منافع حاصل ہوگا۔

بروشر مفت منگوائیں

بکنگ پہلے آئیے پہلے پائیے کی بنیاد پر ہو رہی ہے

تحریکِ اسلامی سے وابستہ افراد کا با اعتماد ادارہ

احباب ایگرو فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

1-اے فیصل روڈ اولڈ مسلم ٹاؤن لاہور فون 5869549-5865371 فیکس 5837016

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۱۲۴	اگست ۱۹۹۷ء ربیع الثانی ۱۴۱۸	عدد ۸

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴

انتظامی امور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۵۵۹۰ ـ ۷۵۸۷۹۹۱

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے

زر سالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت۔/۳۰۰

بنگلہ دیش، ایران۔/۴۵۰

مشرق وسطیٰ، یورپ،

مشرق بعید، افریقہ۔/۶۵۰

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا۔/۹۰۰

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

ترجمان القرآن کے سابق مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے کے لیے برادران اسلام سے اعانت کی جو درخواست کی گئی تھی، اس کے جواب میں اب تک چار سو روپے حالی اور پچاس روپے کلدار دفتر کو وصول ہوئے ہیں اور مزید پچاس روپے کلدار کا وعدہ ہے۔ جن اصحاب نے ہماری اس درخواست پر توجہ کی ان کا ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور اس خلوص نیت کا اجر عطا فرمائے جس کے ساتھ انھوں نے دنیا کے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انفاق مال کیا ہے۔

اگرچہ یہ رقم اس کام کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم انجام دینا چاہتے ہیں، لیکن خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے کام کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ مضامین کی ترتیب اور نظرثانی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ ماہ رمضان سے اشاعت کا آغاز ہو جائے گا۔

رسالہ کی توسیع اشاعت کے لیے بھی ناظرین کو توجہ دلائی گئی تھی۔ اگرچہ اس سے اشاعت میں کوئی ایسا بڑا اضافہ نہیں ہوا جو رسالہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے کے لیے کافی ہو، صرف ساٹھ ستر نئے خریدار مہیا ہوئے، لیکن ناظرین رسالہ میں سے متعدد حضرات نے جس خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ہماری اپیل پر توجہ کی اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ جو لوگ اس رسالے کو ملاحظہ فرماتے ہیں ان کی ایک بڑی اکثریت اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے اغراض و مقاصد سے دلی ہمدردی رکھتی ہے، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔ جن اصحاب نے توسیع اشاعت کے لیے عملاً کوشش کی، ان کا شکریہ ہم پر واجب ہے، اگرچہ اصل شکریہ تو اللہ ہی ادا کرے گا جس کا کام سمجھ کر انھوں نے اس آواز کو اپنے دوسرے بھائیوں تک پہنچانے میں حصہ لیا۔

پچھلے مہینے ایک صاحب خیر مسلمان رئیس نے پچیس روپے عنایت فرمائے تھے کہ ان کی طرف سے غریب مسلمانوں کے نام مفت یا رعایتی قیمت پر رسالہ جاری کر دیا جائے چنانچہ ایک دارالمطالعہ کو مفت اور آٹھ اشخاص کو نصف قیمت پر ایک سال کے لیے رسالہ دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے پاس بکثرت درخواستیں ایسے لوگوں کی آ رہی ہیں جو رسالہ پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں لیکن پورا چندہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ جن اصحاب کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اگر وہ اس سلسلے میں تھوڑی تھوڑی مدد فرمائیں تو ان کے بہت سے غریب بھائیوں کو رسالے سے استفادے کا موقع مل سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ خود ادارہ ترجمان القرآن کی مالی حالت اب کسی رعایت کی متحمل نہیں ہے۔

(ترجمان القرآن، اشارات، جلد ۱۰، عدد ۶ اور جلد ۱۱، عدد ۱، اگست، ستمبر ۱۹۳۷ / جمادی الاخر رجب ۱۳۵۶ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پاکستان کی دہلیز پر انقلاب کی دستک

قاضی حسین احمد

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر اگر ہم اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس عرصے میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا' تو سب سے پہلے ہمیں یہ ناقابل رشک منظر نظر آتا ہے کہ وہ پاکستان جو قائداعظمؒ کی رہنمائی میں ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں بنا تھا' دولخت ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان' بنگلہ دیش بن گیا ہے جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے بڑا ہے۔ اسی طرح انڈونیشیا اور بھارت کے اندر بھی مسلمانوں کی آبادی پاکستان سے زیادہ ہے۔ اس طرح پاکستان نہ صرف دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک ہونے کے اعزاز سے محروم ہو چکا ہے' بلکہ بچے کھچے پاکستان کا حال بھی یہ ہے کہ سخت بے یقینی کی صورت حال ہے۔ علاقائی' نسلی اور لسانی عصبیت کے ساتھ ساتھ مذہبی فرقہ واریت بھی عروج پر ہے۔ مسلمان قوم اور نظریاتی مملکت کی حیثیت سے ہم اپنی شناخت ہی قائم نہیں کر سکے اور نہ نئی نسل کے ذہنوں میں ایک اسلامی ریاست کا صحیح تشخص بٹھا سکے ہیں۔ اس کے برعکس شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے کہ اسلام اور پاکستان کے بجائے وطنیت اور قومیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس حقیقت کو صاف نظرانداز کر دیا گیا کہ اسلامی نظریے کو نظرانداز کرنے کے بعد ہر حوالہ مصنوعی بن جاتا ہے۔ خصوصاً وطنی قومیت تو پاکستان کا حوالہ کسی طرح بن ہی نہیں سکتی۔ پاکستان کو تو ایک وطن' ہندستان کو تقسیم کر کے حاصل کیا گیا تھا۔ اس نظریے سے انحراف کا نتیجہ ہے کہ آج ہم پانچ بڑے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں اور مزید تقسیم در تقسیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ پاکستانی کے بجائے ہمیں پنجابی' سندھی' بلوچی' پٹھان اور مہاجر کی نسبتیں زیادہ محبوب ہیں۔ نظریہ پاکستان سے انحراف ہی کا نتیجہ ہے کہ مہاجر قومیت کا مصنوعی نعرہ لگایا گیا' ورنہ یہ بات کون نہیں جانتا کہ مہاجر اس شخص کو کہتے

ہیں جو اللہ کے دین کی خاطر اپنے وطن سے ہجرت کرے۔

وہ لوگ جو دین کی خاطر ہندستان میں اپنے وطن' مال و دولت اور ہم زبان و ہم قبیلہ لوگوں کو چھوڑ کر آئے تھے' وہ یقیناً مہاجر تھے مگر پاکستان میں اس نظریے سے منہ موڑ لیا گیا۔ ان کے بچوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے آباو اجداد نے جس دین کی خاطر قربانیاں پیش کی تھیں' وہ تو موجود نہیں' بلکہ وطن پرستی کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے تو انھوں نے اپنے آپ کو یہاں اجنبی محسوس کیا۔ اسی اجنبیت کو ختم کرنے کے لیے انھوں نے مہاجر کا نعرہ لگایا۔ اس نعرے کے نتیجے میں وہ خود بھی مشکل میں مبتلا ہوئے اور پورے ملک کو بھی مصیبت میں ڈال دیا۔ یہی کچھ بنگالیوں نے کیا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں پاکستانی کے بجائے کوئی پنجابی ہے' کوئی سندھی' کوئی بلوچ اور کوئی پٹھان' تو انھوں نے کہا: ٹھیک ہے! ہم بنگالی ہیں۔ انھوں نے ناطہ ہی توڑ لیا۔

پاکستان کا نظریاتی تشخص اجاگر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اس کا نظام تعلیم نظریاتی بنیادوں پر استوار کیا جاتا' ذرائع ابلاغ پاکستانیت اور اسلامیت کے فروغ کے لیے کام کرتے' مگر ان اداروں کو سیکولر طور طریقے سے چلانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ملک کی باگ ڈور برطانوی استعمار نے جن ہاتھوں کو سونپی تھی' انھوں نے استعماری طریقوں کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی۔ دراصل برطانوی استعمار دو مقاصد لے کر یہاں آیا تھا۔ پہلا مقصد یہ تھا کہ اس کی تہذیب یہاں پھیلے۔ دوسرا مقصد ایک استحصالی نظام قائم کر کے یہاں کی دولت سمیٹ کر انگلستان لے جانا تھا۔ ان کے بعد ان کے شاگردوں اور ذہنی غلاموں نے بڑی محنت اور شوق سے یہاں مغربی تہذیب کی آبیاری کی۔ تعلیمی نظام کے وہی خدوخال باقی رکھے۔ ذرائع ابلاغ کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ مختلف حیلے بہانوں سے انگریزی زبان کو بھی برقرار رکھا گیا۔ انھوں نے اردو یا علاقائی زبانوں کو ترقی دینے پر کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ ہمیشہ یہ استدلال پیش کرتے رہے کہ انگریزی تو ترقی کے لیے ایک نعمت ہے' اسے کیسے چھوڑ دیں۔ جہاں تک معاشی استحصال کا معاملہ ہے' تو انگریزوں کے یہ شاگرد اپنے استادوں پر بھی بازی لے گئے۔ شاید انگریز اتنی دولت لوٹ کر اپنے ہاں منتقل نہیں کر سکا تھا جتنی دولت یہ لوٹ کر یورپ اور امریکہ لے گئے ہیں۔ اخبارات میں کئی بار یہ بات شائع ہو چکی ہے کہ ہمارے بڑے سیاست دانوں اور بیورو کریٹوں کے پچاس ارب ڈالر صرف سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں موجود ہیں۔

ہمارے ملک پر کل بیرونی قرض' تیس ارب ڈالر ہے۔ ہم اس قرض کو اتارنے کے لیے مزید قرض لیتے ہیں۔ اس کا بڑا حصہ قرض کا سود ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ دولت لوٹ کر باہر لے جانے والے ہمارے پندرہ بڑے سیاست دانوں کے نام وال سٹریٹ جرنل (Wall Street Journal) میں شائع ہوئے ہیں۔ ان سیاست دانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ بیرونی بنکوں میں ان میں سے ہر ایک کا اکاؤنٹ ایک

ارب ڈالر سے زیادہ کا ہے۔ اس فہرست میں بے نظیر اور نواز شریف دونوں کے نام شامل ہیں۔ ہم نہیں کہتے کہ مذکورہ جرنل کی یہ معلومات سو فیصد درست ہیں، لیکن اگر یہ غلط ہیں تو ابھی تک اس اخبار کے خلاف مقدمات کیوں نہیں کیے گئے؟ امریکہ اور یورپ میں تو ایسے مقدمات پر فوری اور سخت کارروائی ہوتی ہے۔ الزام غلط ثابت ہو جائے تو بھاری جرمانے وصول کیے جاتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مقدمے اس لیے نہیں کیے کہ ان کے بڑے بڑے بنک اکاؤنٹ موجود ہیں۔ بلین ڈالر نہ سہی، کم سہی۔ یہ کھلا راز ہے کہ بیرونی ملکوں میں ان کی دولت بھی ہے، جایدادیں بھی ہیں۔ ان کے خاندان کے بہت سے افراد وہاں رہتے بھی ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ خود بھی وہاں جا کر مقیم ہو جاتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ میں جو لوگ دولت جمع کر رہے ہیں اور جو یہاں پر مغربی تہذیب کے محافظ ہیں، ان کے سرمائے کی بیرون ملک بنکوں میں حفاظت بھی کی جاتی ہے۔ ان کو کوئی خطرہ ہو تو باہر انھیں پناہ بھی مل جاتی ہے مگر اس سے ہمارا نظام اور ہماری نظریاتی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پاکستان ایک مضبوط اسلامی نظریاتی ملک بننے کے بجائے عملی طور پر ایک کمزور اور بے سمت و منزل ملک بن کر رہ گیا ہے جہاں لسانی اور علاقائی تعصبات زوروں پر ہیں۔ ملک کی یک جہتی اور نظریے کی اساس پر اتحاد کی کوئی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی گئی، اس سے فرقہ واریت اور مسلکی اختلاف بھی بڑھتا رہا۔ دینی تعلیم یہاں ان علما کے ہاتھ میں ہے جو دین سے زیادہ اپنے مسلک سے محبت کرتے ہیں اور جو مشترکات کے بجائے اختلاف پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

شیعہ سنی اختلاف بہت پہلے سے چلا آ رہا تھا، جسے قتل و غارت گری تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اب تو معمولی اختلافات شدید ذاتی انتقام اور نفرت میں ڈھل گئے ہیں اور لوگوں کو بے دردی سے مسجدوں میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث کے تعصبات بھی بستی بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مساجد کے نام، ان کی پیشانیوں پر، مسلک کے اعتبار سے لکھے ہوتے ہیں اور اس طرح ایک امت واحد کو کئی گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ بقول اقبالؒ ۔ "ملتے بودی ملل گردیدہ ای"۔ انگریزی استعمار کے "لڑاو اور حکومت کرو" کے اصول کے مطابق حکومت اور بیوروکریسی مذہبی طبقے کو بانٹ کر انھیں کمزور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سے مذہبی طبقہ بدنام ہو رہا ہے اور بے اثر ہو چکا ہے۔ انتہا پسند اور جنونی لوگ بے لگام ہو چکے ہیں اور حکومت انھیں شہ دے رہی ہے۔ قتل و غارت گری کی جا رہی ہے، مگر کسی کو سزا نہیں ملتی۔

اس صورت حال میں اطمینان کی واحد صورت ایسے لوگوں کا بڑی تعداد میں موجود ہونا ہے جنھیں بچے

کھچے پاکستان کے بارے میں حقیقی فکرمندی ہے۔ ایک احساس زیاں ہے۔ میرے خیال میں قوم کے اندر یہ فکر مندی واحد صحت مند علامت ہے۔ میں نے اس احساس کا بڑے پیمانے پر ادراک کیا ہے۔ لوگ ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے ہیں کہ کیا ہو گا اور کیا ہونا چاہیے۔ اس افراتفری اور مایوسی کے دور میں لوگوں کے اس احساس اور فکرمندی کو، میں انقلاب آفریں مرحلہ اور ایک turning point سمجھتا ہوں۔ یہ زندہ احساس اس لیے زندہ ہے کہ اگر گذشتہ نصف صدی میں ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہے تو دوسری طرف مختلف پرائیویٹ اداروں، جماعتوں اور دین کا درد رکھنے والی شخصیات کی طرف سے مثبت کوششیں بھی کی جاری رہی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دین کی طرف رجوع کا ایک قوی رجحان لوگوں میں موجود ہے۔ نوجوانوں میں نماز قائم کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ قرآن حفظ کرنے والوں اور تجوید سیکھنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کا رجحان ہے۔ جدید تعلیم کے اداروں میں بھی خاصی بڑی تعداد دینی رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کی ہے۔ حکومت اور اس کے تمام اداروں کی طرف سے مغربیت، عریانی اور فحاشی کی سرپرستی کے باوجود عوام میں اسلام پر مرمٹنے والے نوجوانوں کا وجود بہت غنیمت ہے۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ بڑے پیمانے پر برائی کی تبلیغ کر رہے ہیں، لیکن نوجوان نسل میں، خواتین میں، اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں برائی کے خلاف مزاحمت موجود ہے۔ اسی طرح اس عرصے میں جہاد کا جذبہ ابھرا ہے۔ نوجوانوں کی خاصی بڑی تعداد نے افغانستان اور کشمیر کے محاذوں پر داد شجاعت دینے کے ساتھ ساتھ جانیں بھی قربان کی ہیں۔ اس سے جہادی کلچر اجاگر ہوا ہے۔ قوم میں خیر کے اس رجحان کی موجودگی کے اثر سے لوگوں میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی خواہش ابھری ہے۔ ۱۹۹۷ کے انتخابات میں لوگوں کی عدم دلچسپی اس خواہش کی مظہر ہے۔ ہمارے اپنے اندازے کے مطابق ۲۰ فی صد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ حکومت نے مبالغہ آرائی کر کے کہا، ۳۵ فی صد ووٹروں نے حق رائے دہی استعمال کیا۔ مبالغہ، انتخابات کو کامیاب ثابت کرنے اور اعتبار پیدا کرنے کے لیے کیا گیا۔ ابھی ایران میں ۸۰ فی صد لوگوں نے ووٹ ڈالے۔ یہاں اگر ۳۵ فی صد کی شرح ہو تو بھی یہ لوگوں کی، اس پورے انتخابی عمل سے، مایوسی کا اظہار ہے۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ عام لوگ آئین پاکستان کی دفعہ ۶۲، ۶۳ پر عمل درآمد کی عدم موجودگی میں اور احتساب کے بغیر، انتخابات کے بارے میں پہلے ہی مایوسی کا شکار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آئین کی ان دفعات پر عمل درآمد اور بے لاگ احتساب کے بغیر اسی قسم کا گروہ پھر برسراقتدار آجائے گا جس سے پیپلزپارٹی کی شکل میں انھوں نے بڑی مشکل سے نجات حاصل کی تھی۔

گذشتہ چار ماہ کے عرصے میں حکومت کی کارکردگی سے لوگوں کے یہ خدشات بڑی حد تک درست ثابت ہو گئے ہیں۔ نواز شریف کے بارے میں جو لوگوں کی تھوڑی بہت خوش فہمی تھی کہ ملک میں معاشی خوش

حالی لائیں گے' وہ بھی مایوسی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ حکومت نے جو بجٹ پیش کیا ہے اس میں ۱۹۵ ارب روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ یعنی ساڑھے پانچ سو ارب کے مصارف ہیں اور آمدنی ۳۴۵ ارب روپے ہے۔ ۱۹۵ ارب روپے کا خسارہ کہاں سے پورا ہو گا؟ اگر بیرونی قرضے حاصل کریں گے تو قرضوں کی ادائیگی کا دباؤ مزید بڑھے گا۔ پہلے ہی ہم ۲۴۵ ارب روپے اس مد میں ادا کر رہے ہیں اور قوم پر بیرونی قرضوں کے علاوہ ۱۰۰۰ ارب روپے کے اندرونی قرضوں کا اتنا بڑا اور بھاری بوجھ بھی لدا ہوا ہے جس نے ہماری معیشت کو نڈھال کر رکھا ہے۔ باہر سے مزید قرضے نہ لیے تو نوٹ چھاپے جائیں گے جس سے افراط زر میں مزید اضافہ ہو گا اور مہنگائی عام آدمی کا جینا مزید حرام کر دے گی۔ اس بجٹ میں تو دفاع کے لیے بھی رقم نہیں بچتی۔ دعویٰ کیا گیا ہے کہ متوازن اور ٹیکس فری بجٹ پیش کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بجٹ پیش ہی نہیں کیا گیا۔ بجٹ تو آمد و خرچ کے توازن اور میزانیے کا نام ہے۔ اس بجٹ کا مطلب قوم کے سامنے اقتصادی لحاظ سے ایک تاریک مستقبل ہے۔ آئی ایم ایف اور دوسرے بیرونی مالیاتی اداروں کے دباؤ کے تحت درآمدات پر تمام ڈیوٹیاں ختم یا کم کر دی گئی ہیں اور وہ سامان درآمد ہو رہا ہے جو ہماری کسی قومی ضرورت کا نہیں۔ اس سے ننانوے فی صد لوگوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ ایک فی صد مراعات یافتہ طبقے کی تعیش کی خواہشات پوری ہوتی ہوں تو ہوں اور اس کا سارا بوجھ ننانوے فی صد غریب عوام پر پڑتا ہے۔

جتنے قرض لیے گئے تھے' وہ ضائع کر دیے گئے۔ بہت سے قرض معاف کرا دیے گئے ہیں۔ ابھی سپریم کورٹ نے تفصیل پوچھی ہے کہ ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ تک جو قرض معاف کیے گئے' ان کی تفصیل پیش کی جائے۔ سب سے زیادہ کرپشن کا عرصہ ۱۹۸۸ سے ۱۹۹۰ تک کا ہے مگر ۱۹۸۵ سے ۱۹۹۰ تک کا عرصہ بلاوجہ احتساب کے قوانین سے مستثنیٰ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکمران خود قرض معاف کرنے میں' قرض ادا نہ کرنے اور پلاٹ الاٹ کرانے کے جرائم میں ملوث ہیں۔ یہ احتساب کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی پارٹی کے ایک سینیٹر کو احتساب کا ذمے دار بنا کر عدلیہ کو اس کے ماتحت کر دیا ہے۔ ہائی کورٹ کے ایک جج نے اسے "گسٹاپو" کہا۔ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ احتساب کا یہ نظام سخت ناقابل اعتبار ہے۔

پیپلز پارٹی کے خلاف جماعت اسلامی کی قیادت میں جو زبردست عوامی تحریک چلی' اس تحریک کی کامیابی کے بعد جماعت نے ۹۷ کے انتخابات میں حصہ لینے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ یہ دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کے مطابق نہیں ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ تحریک اس بنیاد پر چلائی گئی تھی کہ گذشتہ دور کی لوٹ مار کا احتساب ہو گا اور کسی لٹیرے کے منتخب ہو کر برسر اقتدار آنے کے امکانات ختم کر دیے جائیں گے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا تھا کہ انتخابات میں حصہ لینے والوں کو دفعہ ۶۲ اور ۶۳ کا پابند کر دیا جاتا۔ دفعہ ۶۲ میں

کہا گیا ہے کہ صرف وہی شخص اسمبلی کے انتخابات کا امیدوار بن سکتا ہے جو دین کا بنیادی علم رکھتا ہو' کبائر سے اجتناب کرتا ہو' فرائض ادا کرتا ہو اور لوگوں میں اچھی شہرت رکھتا ہو۔ مگر بغیر احتساب کے اور بغیر آئین کی متعلقہ دفعہ کا لحاظ رکھے' انتخابات کرا دیے گئے۔ چنانچہ جماعت نے واضح آئینی اور قانونی بنیادوں پر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ ہم نے کہہ دیا تھا یہ انتخابات ہمیں کسی منزل کی جانب نہیں لے جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں ایک اور لٹیرا گروہ برسراقتدار آ جائے گا۔ انتخابات کے جو نتائج نکلے' جو لوگ اقتدار میں آئے اور انھوں نے گذشتہ عرصے میں جس کردار کا مظاہرہ کیا' اس کے بعد لوگوں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ دونوں گروہ ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رخ ہیں۔ لوگوں میں پیپلزپارٹی کی طرح مسلم لیگ سے بھی مایوسی پیدا ہو چکی ہے۔ انھوں نے نواز شریف سے جو کچھ امیدیں وابستہ کی تھیں وہ بھی خاک میں مل گئی ہیں۔ لوگوں نے اپنے اس ردعمل کا واضح طور پر اظہار بھی کرنا شروع کر دیا ہے۔ جماعت اسلامی کے جو وفود ممبرسازی کے لیے عوام کے پاس جاتے ہیں' وہ واپس آکر بتاتے ہیں کہ لوگ جماعت اسلامی کو امید کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں اور جماعت اسلامی نے عوام سے رابطے کا جو راستہ نکالا ہے' لوگ اس کی تحسین کر رہے ہیں۔

ممبرسازی کی اس مہم کا ہمیں دہرا فائدہ ہوا ہے۔ اس سے جہاں لوگوں کی مایوسی امید میں بدلنے لگی اور وہ ملک کے مستقبل کو حقیقی معنوں میں سنوارنے کے لیے جماعت اسلامی کی قیادت قبول کرنے پر آمادگی کا اظہار کر رہے ہیں وہاں ہمارے اپنے کارکنوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ وہ متحرک ہو رہے ہیں۔ جس طرح بہتے پانی سے جراثیم مرجاتے ہیں' اسی طرح اس تحرک سے بھی تساہل اور کاہلی کے اثرات ختم ہو گئے ہیں۔ ہمارے کارکن خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے' اللہ کے راستے میں نکلے ہیں۔ مساجد میں ذکر کی مجلسیں ہوتی ہیں۔ اپنی تربیت ہوتی ہے۔ اعمال سنوارنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت بڑے پیمانے پر لوگوں کے ساتھ رابطہ ہوا ہے اور بڑے پیمانے پر پذیرائی ملی ہے۔ عام طور پر ایک سو ملاقاتوں میں سے ۸۰ افراد ممبر بن جاتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں نصف لوگ ممبر بن جاتے ہیں۔ اب تک جہاں سے کم سے کم ممبر بننے کا رجحان سامنے آیا ہے' وہ بھی ۲۵' ۳۰ فی صد کی نسبت ہے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ ممبر نہ بننے والے لوگ بھی مخالفت نہیں کرتے' تاہم مختلف وجوہ بیان کر کے ممبر بننے سے معذرت کرتے ہیں۔ جماعت کے کارکنوں کو اس سے زبردست حوصلہ ملا ہے۔ اب تک کے اعداد و شمار کے مطابق ملک میں بارہ لاکھ افراد ممبر بن چکے ہیں اور ستمبر کے اواخر تک ہمارا اندازہ ہے کہ ان شاء اللہ پچاس لاکھ ممبر بنانے کا ہدف پورا کر لیا جائے گا۔

پچاس لاکھ ممبر بن جائیں گے تو ان شاء اللہ منظر بالکل تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم تنظیم کا کام بھی کر رہے ہیں۔ ہمارے کارکن جہاں بھی جاتے ہیں' گلی محلے اور یونین کونسل کے ہر وارڈ کی سطح تک جماعت اسلامی کی رابطہ کمیٹی بنا دیتے ہیں۔ اس رابطہ کمیٹی میں صدر' نائب صدر' جنرل سیکرٹری'

جائنٹ سیکرٹری، ناظم بیت المال اور دوسرے پانچ چھ افراد پر مشتمل مجلس عاملہ قائم ہو جاتی ہے۔ یہ دس پندرہ آدمیوں پر مشتمل رابطہ کمیٹی مل کر کام کرنے والی ایک ٹیم بن جاتی ہے۔ یہ یونٹ تقریباً ایک سے دو ہزار آبادی کی نمایندگی کرے گا۔ ان شاء اللہ یہ وہاں مختلف شعبوں میں اقدام پیشہ اور Initiative لینے والے ہوں گے۔ یہ کمزور، غریب اور ضرورت مند عوام کی مسائل حل کریں گے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوں گے۔ ظلم کے خلاف، غنڈہ گردی کے خلاف یہ عوام کو منظم کریں گے۔ جہاں وسائل ملیں گے، وہاں کوئی تعلیمی ادارہ اور خدمت خلق کا کوئی ادارہ قائم کر دیں گے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ آبادی کے اندر بہت گہرائی تک ہمارا پیغام اور دعوت پہنچے گی۔ اس پورے عمل کے نتیجے میں ان شاء اللہ ایک بڑی تبدیلی--- ایک زبردست انقلاب کا آغاز ہو گا۔ ہم نے اپنے کارکنوں سے کہا ہے کہ جہاں بھی رابطہ کمیٹی قائم ہو، وہاں ایک دفتر بھی قائم کر دیں۔ اس دفتر پر جماعت کا تین رنگوں والا بورڈ لگا کر اس پر لکھ دیں--- "جماعت اسلامی رابطہ کمیٹی"، فلاں وارڈ یا محلہ وغیرہ۔ اس پر جماعت اسلامی کا جھنڈا لگا دیں۔ اس سے ان شاء اللہ پورے ملک میں یہ تاثر بھی ختم ہو جائے گا کہ جماعت اسلامی مخصوص لوگوں کی چھوٹی سی جماعت ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف پہلے ہی لوگ کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی دیانت دار اور بے لوث افراد کی منظم ترین جماعت ہے اور یہ کرپشن کو مٹا سکتی ہے، وہاں یہ بات بھی چند ماہ کے اندر اندر انشاء اللہ مسلمہ حقیقت بن جائے گی کہ جماعت اسلامی ملک کی سب سے بڑی عوامی تحریک ہے۔ یہ انقلاب لانے کی صلاحیت کی حامل ہے اور اس کے پاس ہر شعبے میں انقلاب لانے کے لیے افرادی قوت اور اہلیت موجود ہے۔ یہ جو پھبتی کسی جاتی ہے کہ "ملا" آجائیں گے اور ملا کا انقلاب آجائے گا، تو ہم یہ واضح کر دیں کہ جماعت اسلامی کسی خاص طبقے کی جماعت نہیں، اس میں ہر مسلک، نسل اور زبان کے لوگ ہیں۔ البتہ اس میں انتہا پسند لوگ شامل نہیں۔ اس میں ہر پیشے اور شعبے کے دین کا درد رکھنے والے لوگ ہیں۔ مزید اچھے لوگ شامل ہو رہے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کی بنیاد پر ایک حقیقی انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کی تیاری کے مرحلے میں ہیں۔

پچاس برسوں میں جہاں استعماری ایجنٹوں نے مختلف ناموں سے اقتدار میں رہ کر ملک کو تباہی کے گڑھے کے کنارے لاکھڑا کیا، وہاں قوم کے اندر خیر کی قوتوں کی شکل میں ایک متوازی احساس موجود رہا ہے، اور وہ اب ایک قوت اور ایک حیات بخش انقلاب کی شکل میں نمودار ہونے والا ہے۔ جماعت اسلامی ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک کی شکل میں انقلاب کا پیغام لے کر ابھری ہے جو قوم کو علاقائی، نسلی اور لسانی اختلافات سے بالاتر ہو کر اسلامی نظریے کی بنیاد پر اکٹھا کرے گی، ایک لڑی میں پروئے گی اور سارے انسانوں کے لیے ایک عادلانہ نظام قائم کرے گی تاکہ ملت اسلامیہ پاکستان ان مقصد کو حاصل کر سکے جن کے لیے یہ ملک قائم ہوا

تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ آخرت میں کامیاب ہو سکے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں جماعت اسلامی "سولو فلائیٹ" چلا رہی ہے۔ یہ سولو فلائیٹ نہیں' یہ تو پوری قوم کو متحد کرنے کی جدوجہد ہے۔ ایک ہمہ گیر دعوت ہے۔ بہت سی جماعتوں کا اتحاد بنا کر کام کرنے کا طریقہ ناکام ہو چکا ہے' اس لیے کہ مختلف جماعتوں میں بالعموم نظریے یا طریق کار کا اختلاف ہوتا ہے یا ان میں شخصیات کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اگر اختلافات کی یہ شکلیں موجود ہوں' اور آپ ایسے لوگوں کو یک جا کر بھی دیں' تو وہ کسی بڑے چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اکثر ایسے لوگ عین وقت پر منتشر ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو بالکل یکسو قیادت میسر نہیں آسکتی اور مزید مایوسی پھیلتی ہے۔ حال ہی میں بارہ جماعتوں کو سیکولر بنیادوں پر اکٹھا کرنے کی ایک کوشش کی گئی' مگر عوام میں اس اتحاد کو پذیرائی نہیں ملی' اس لیے کہ ان میں سے اکثر جماعتوں اور لیڈروں کے نام بھی لوگوں کو معلوم نہیں۔ اسی طرح ایک جگہ کھانے پر کچھ جماعتوں کی رہنما اکٹھے ہوئے' وہاں بھی اتحاد بنانے کی بات ہوئی' مگر اکثر شرکا نے وہیں پر اس سے اختلاف کیا۔ اس قسم کے اتحاد لوگوں کے اندر کسی قسم کی امید پیدا کرنے کا باعث نہیں بن پاتے' جب کہ جماعت اسلامی کو بڑے پیمانے پر امید بھری نظروں سے دیکھا جا رہا ہے' اس لیے کہ لوگوں کو اس کی شکل میں درست سمت میں رہنمائی اور یکسو قیادت مل رہی ہے۔

الحمدللہ قافلہ منظم ہو چکا ہے' امید کی روشنی پھیل رہی ہے۔ اس مرحلے پر میں ایک خدشے کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہا جاتا ہے جس طرح الجزائر میں غیر ملکی طاغوتی طاقتوں نے اسلامی تحریک کے برسراقتدار آنے کو برداشت نہیں کیا اور قوت کے بل بوتے پر اسلامی فرنٹ (FIS) کو دبانے کی کوشش کی' تو کیا یہاں پاکستان میں ایسا نہیں ہو گا؟ ہمارے خیال میں اگر اس ضمن میں دینی قوتوں کے خلاف فوج کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو فوج کی یکسوئی بری طرح متاثر ہو گی۔ فوج میں بہت بڑی تعداد میں دینی اور اسلامی عناصر موجود ہیں جو عوام کی پرامن اور جمہوری طریقے سے اٹھائی گئی تحریک کو کچلنے کے عمل سے متاثر ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فوجی قیادت فوج کے مضبوط اور متحد ادارے کی یکسوئی متاثر کرنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ ملک میں واحد مضبوط ادارے کے اتحاد کو داؤ پر لگانا ملک دشمنی ہو گی۔ فوج خود عوامی قوت کے خلاف کھڑا ہونا قبول نہیں کرے گی لیکن شرط یہ ہے کہ عوام (masses) پوری طرح تحریک کا ساتھ دیں اور پرامن رہیں۔

ایک خدشہ یہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ ملک کا نظام تباہی سے دوچار ہے' آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے' امن و امان کی حالت خراب ہے' رشوت اور کرپشن ہے' ملک کی دولت کو لوٹا گیا ہے۔ کیا جماعت اسلامی اس خرابی کی اصلاح کر پائے گی اور اگر کوئی تبدیلی آ بھی گئی تو کیا جماعت عوام کی توقعات پر پورا اتر سکے گی؟ ہم سمجھتے ہیں اگر ایک اچھی اور بے لوث قیادت ملک کو میسر آ جائے جس کی پشت پر ایک منظم تحریک ہو' جس

کے مخلص اور دیانت دار کارکن ملک کی ہر بستی اور ہر گلی کوچے میں موجود ہوں اور وہ یہ تہیہ کرلیں کہ ہم عدل و انصاف کے لیے کام کریں گے' معاشرے کی تطہیر کے لیے جان لڑا دیں گے' اختیارات کا ناجائز استعمال نہیں کریں گے تو یہ عین ممکن ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مراعات یافتہ طبقے نے "ایلیٹ کلچر" بنا رکھا ہے جو عوام سے بالاتر رہتے اور اپنے معیار زندگی کو بلند رکھتے ہیں اور جو اپنے لیے پچاس ہزار اور ایک لاکھ روپے ماہانہ آمدنی کو بھی کم سمجھتے اور غریب طبقے کے لیے دو چار ہزار روپے کو بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ ہم اس طرح کے کلچر کو ختم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اسے ختم کریں گے۔ ہمارے تمام کارکن متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ حکومت میں جا کر حکومتی خزانے پر بوجھ نہیں بنیں گے' بلکہ قومی خزانے کو غریب عوام کے لیے وقف کر دیں گے۔ قیادت پہلے ہی مرحلے پر عوام کو یقین دلا دے گی کہ وہ ان میں سے ہے۔ کوئی بھی صدر یا وزیراعظم کے محل کو استعمال نہیں کرے گا۔ گذشتہ بجٹ میں صرف ان دو گھروں کا خرچ ۱۷۲ کروڑ تھا۔ ہم نے بار بار کہا ہے کہ سرکاری فرائض اپنے سیکرٹریٹ میں ادا کر سکتے ہیں' اپنی ذاتی زندگی عوام کی سطح پر گزاریں۔

ہمارے خیال میں حاکم' بڑے افسر اور ایک عام شخص کے لیے یکساں اصول زندگی ہونا چاہیے کہ اس کے پاس ایسا مکان ہو جس کی دیکھ بھال اس کے گھر کے افراد خود کر سکیں۔ اس کی بیوی خود کھانا پکائے۔ اس کے گھر میں افراد خانہ سے زیادہ تعداد نوکروں کی نہ ہو' بلکہ گھر کے افراد خود مل کر کام کریں۔ الحمدللہ ہم پہلے ہی ایسی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ معیار زندگی ہر جگہ اپنا سکتے ہیں۔ ہمارے کارکنوں کی بھی یہی تربیت ہے اور ہمارے بچوں کو بھی یہی سکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی طرز عمل کو ہم اپنے اور اپنی اولاد کے لیے مضر اور مخرب اخلاق سمجھتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے بعض افراد کے پاس اس وقت بھی وسائل موجود ہیں' لیکن انھوں نے اپنا کلچر تبدیل نہیں کیا۔ اگر جماعت کے لوگوں کے پاس اختیارات آ گئے تو وہ اس سے بھی کم تر معیار زندگی اپنانے پر بخوشی رضامند ہو جائیں گے۔ یہ پوری طرح اس بات پر آمادہ ہیں کہ انھیں ملک و قوم کو تباہی کے گڑھے سے نکالنے اور بچانے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے' چاہے کیسی ہی قربانی دینی پڑے۔ ہم جو انقلاب لانا چاہتے ہیں اس میں پوری قوم کو جہادی سپرٹ اور شہادت کے جذبے سے شریک کرنا چاہتے ہیں۔ ہم پوری پاکستانی قوم کو اس بات کے لیے تیار کر رہے ہیں کہ اپنی آزادی کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اقبال نے کہا ہے۔

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

مسلمان قوم کی قوت کا راز اس بات میں پنہاں ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں مرنے کے لیے ہمہ وقت تیار

رہتی ہے۔ اس بات کو قرآن پاک میں یوں بیان کیا گیا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (الانعام ۶: ۱۶۲)، "کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے"۔ جو موت کے سرمائے کو اللہ کے لیے وقف کر دیتا ہے، صحیح معنوں میں آزادی کا لطف بھی وہی اٹھا سکتا ہے۔

جماعت اسلامی اس تمدن کو بدل کر شرافت، پاک بازی اور جہاد کا کلچر لانا چاہتی ہے۔ موجودہ تمدن جس میں بے حیائی اور فحاشی کو فروغ مل رہا ہے، یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس نے معاشرے کو فساد اور مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ جب جہاد کا کلچر پھیلے گا تو ہماری پوری نوجوان نسل کم تر اور گھٹیا مشاغل چھوڑ کر اعلیٰ مقاصد اور ارفع نصب العین کے لیے جینا شروع کر دے گی۔ جماعت اسلامی گذشتہ پچاس برس سے اس نظام کے لیے تیاری کرتی آئی ہے۔ ہم سود سے پاک معیشت کا نظام لانے کے لیے پوری طرح تیاری (home work) کر چکے ہیں۔ ہم ملک کو ایک جامع نظام تعلیم دیں گے۔ ہم نوجوان نسل کے لیے صحت مند تفریح اور دلچسپ مشاغل کا ایک پیکج دیں گے جس سے ان کی صلاحیتوں کو نکھار ملے گا اور وہ معاشرے کے لیے مفید شہری بنیں گے۔ ان شاء اللہ ہم اپنی فوج کو مضبوط تر بنائیں گے، اس کی دفاعی صلاحیت میں اضافہ کر کے اسے ناقابل تسخیر بنا ڈالیں گے۔ اگر کسی کے دل میں یہ وہم ہے کہ امریکہ ہمیں اسلحے کی ترسیل روک دے گا، تو اب اسلحہ فروخت کرنے والے لوگوں میں مسابقت ہے، ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ امریکہ کی بات روس سنتا ہے نہ فرانس اور نہ جرمنی۔ ہم جہاں سے چاہیں اسلحہ حاصل کریں گے۔

جماعت اسلامی کو دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں اپنے کارکنوں کی تربیت اور تنظیم کا زیادہ موقع ملا ہے۔ اس کے کارکن ایسی بڑی طاقت ہیں کہ جو حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ آیندہ چند ماہ کے دوران میں یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہمارے یہ کارکن پورے منظر کو بدلنے کی کیسی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے تمام بہی خواہوں کے مشورے کے ساتھ ملک کے لیے ایک بہتر لائحہ عمل طے کریں گے۔ جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ سے باہر بھی، پوری دنیا میں جماعت اسلامی کے پروگرام اور دعوت سے محبت رکھنے والے اہل الرائے لوگ ہیں۔ ملک کے لیے نئے نظام کی تشکیل میں ان سب حضرات کے مشورے سے بھی فائدہ اٹھایا جائے گا، ان شاء اللہ۔

اس طرح ہم ملک کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر ان شاء اللہ اپنی قوم کو مایوسیوں کے عمیق غار کے دہانے سے نکال کر روشن مستقبل کی واضح نشاندہی کریں گے اور انھیں آزادی کے حقیقی معنی سے آشنا کر کے اس کے ثمرات سمیٹنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اگر ہم اللہ کی توفیق سے اس میں کامیاب ہو سکے تو پچاسویں سالگرہ کے موقع پر قوم کے لیے اور آیندہ نسلوں کے لیے یہ ایک بہترین تحفہ ہو گا۔

رحمت کا استحقاق

انسانی تاریخ میں جتنی قومیں بھی تباہ ہوئی ہیں‘ ان سب کو جس چیز نے گرایا‘ وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے نشے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو برائیوں سے روکتے‘ یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ رک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخرکار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں‘ ورنہ اللہ کو اپنے بندوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ وہ تو بھلے کام کر رہے ہوں اور اللہ ان کو خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے۔ یہاں تین باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:

ایک یہ کہ ہر اجتماعی نظام میں ایسے نیک لوگوں کا موجود رہنا ضروری ہے جو خیر کی دعوت دینے والے اور شر سے روکنے والے ہوں۔ اس لیے کہ خیر ہی وہ چیز ہے جو اصل میں اللہ کو مطلوب ہے‘ اور لوگوں کے شرور کو اگر اللہ برداشت کرتا بھی ہے تو اس خیر کی خاطر کرتا ہے جو ان کے اندر موجود ہو اور اسی وقت تک کرتا ہے جب تک ان کے اندر خیر کا کچھ امکان باقی رہے۔ مگر جب کوئی انسانی گروہ اہل خیر سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف شریر لوگ ہی باقی رہ جائیں‘ یا اہل خیر موجود ہوں بھی تو کوئی ان کی سن کر نہ دے اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے‘ تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح منڈلانے لگتا ہے جیسے پورے دنوں کی حاملہ کہ کچھ نہیں کہہ سکتے کب اس کا وضع حمل ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر صرف انھی چند گنے چنے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو‘ جو اسے برائیوں سے روکتے اور بھلائیوں کی دعوت دیتے ہوں تو سمجھ لو کہ اس کے برے دن قریب آ گئے ہیں‘ کیونکہ اب وہ خود ہی اپنی جان کی دشمن ہو گئی ہے‘ اسے وہ سب چیزیں تو محبوب ہیں جو اس کی ہلاکت کی موجب ہیں اور صرف وہی ایک چیز گوارا نہیں ہے جو اس کی زندگی کی ضامن ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا آخری فیصلہ جس چیز پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں دعوت خیر پر لبیک کہنے والے عناصر کس حد تک موجود ہیں۔ اگر اس کے اندر ایسے افراد اتنی

تعداد میں نکل آئیں جو فساد کو مٹانے اور نظام صالح کو قائم کرنے کے لیے کافی ہوں تو اس پر عذاب عام نہیں بھیجا جاتا بلکہ ان صالح عناصر کو اصلاح حال کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر پیہم سعی و جہد کے باوجود اس میں سے اتنے آدمی نہیں نکلتے جو اصلاح کے لیے کافی ہو سکیں اور وہ قوم اپنی گود سے چند ہیرے پھینک دینے کے بعد اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیتی ہے کہ اب اس کے پاس کوئلے ہی کوئلے باقی رہ گئے ہیں تو پھر کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی کہ بھٹی سلگا دی جاتی ہے جو ان کوئلوں کو پھونک کر رکھ دے۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا تھا کہ ان میں اہل خیر کا موجود نہ رہنا یا بہت کم پایا جانا بھی تو آخر اللہ کی مشیت ہی سے تھا، پھر اس کا الزام ان قوموں پر کیوں رکھا جائے؟ کیوں نہ اللہ نے ان کے اندر بہت سے اہل خیر پیدا کر دیے؟ اس کے جواب میں یہ حقیقت حال صاف صاف بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کی مشیت انسان کے بارے میں یہ ہے ہی نہیں کہ حیوانات اور نباتات اور ایسی ہی دوسری مخلوقات کی طرح اس کو بھی جبلی طور پر ایک لگے بندھے راستے کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے۔ اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو پھر دعوت ایمان، بعثت انبیا اور تنزیل کتب کی ضرورت ہی کیا تھی، سارے انسان مسلم و مومن ہی پیدا ہوتے اور کفر و عصیان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہوتا لیکن اللہ نے انسان کے بارے میں جو مشیت فرمائی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اس کو انتخاب و اختیار کی آزادی بخشی جائے، اسے اپنی پسند کے مطابق مختلف راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے، اس کے سامنے جنت اور دوزخ دونوں کی راہیں کھول دی جائیں اور پھر ہر انسان اور ہر انسانی گروہ کو موقع دیا جائے کہ وہ ان میں سے جس راہ کو بھی اپنے لیے پسند کرے، اس پر چل سکے تا کہ ہر ایک جو کچھ بھی پائے اپنی سعی و کسب کے نتیجہ میں پائے۔ پس جب وہ اسکیم جس کے تحت انسان پیدا کیا گیا ہے، آزادیِ انتخاب اور اختیاری کفر و ایمان کے اصول پر مبنی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم خود تو بڑھنا چاہے بدی کی راہ پر اور اللہ زبردستی اس کو خیر کے راستے پر موڑ دے۔ کوئی قوم خود اپنے انتخاب سے تو انسان سازی کے وہ کارخانے بنائے جو ایک سے ایک بڑھ کر بدکار اور ظالم اور فاسق آدمی ڈھال ڈھال کر نکالیں، اور اللہ اپنی براہ راست مداخلت سے اس کو وہ پیدائشی نیک انسان مہیا کر دے جو اس کے بگڑے ہوئے سانچوں کو ٹھیک کر دیں۔

اس قسم کی مداخلت خدا کے دستور میں نہیں ہے۔ نیک ہوں یا بد، دونوں قسم کے آدمی ہر قوم کو خود ہی مہیا کرنے ہوں گے۔ جو قوم بحیثیت مجموعی بدی کی راہ کو پسند کرے گی جس میں سے کوئی معتدبہ گروہ ایسا نہ اٹھے گا جو نیکی کا جھنڈا بلند کرے، اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں اس امر کی گنجایش ہی نہ چھوڑی ہو گی کہ اصلاح کی کوششیں اس کے اندر پھل پھول سکیں، خدا کو کیا پڑی ہے کہ اس کو بزور نیک بنائے۔ وہ تو اس کو اسی انجام کی طرف دھکیل دے گا جو اس نے خود اپنے لیے انتخاب کیا ہے۔ البتہ خدا کی رحمت کی مستحق اگر

کوئی قوم ہو سکتی ہے تو صرف وہ جس میں بہت سے افراد ایسے نکلیں جو خود دعوت خیر کو لبیک کہنے والے ہوں اور جس نے اپنے اجتماعی نظام میں یہ صلاحیت باقی رہنے دی ہو کہ اصلاح کی کوشش کرنے والے اس کے اندر کام کر سکیں۔

کفرو اسلام کی اس کش مکش کے دونوں فریق جو کچھ کر رہے ہیں' وہ سب اللہ کی نگاہ میں ہے۔ اللہ کی سلطنت کوئی اندھیر نگری چوپٹ راجا کی مصداق نہیں ہے کہ اس میں خواہ کچھ ہی ہوتا رہے' شہ بے خبر کو اس سے کچھ سروکار نہ ہو۔ یہاں حکمت اور بردباری کی بنا پر دیر تو ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔ جو لوگ اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں وہ یقین رکھیں کہ ان کی محنتیں ضائع نہ ہوں گی اور وہ لوگ بھی جو فساد کرنے اور اسے برپا رکھنے میں لگے ہوئے ہیں' جو اصلاح کی سعی کرنے والوں پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں' اور جنھوں نے اپنا سارا زور اس کوشش میں لگا رکھا ہے کہ اصلاح کا یہ کام کسی طرح چل نہ سکے' انھیں بھی خبردار رہنا چاہیے کہ ان کے یہ سارے کرتوت اللہ کے علم میں ہیں اور ان کی پاداش انھیں ضرور بھگتنی پڑے گی۔

(تفہیم القرآن' جلد دوم' ص ۳۷۲ - ۳۷۵)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اہل جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں

تم ہمیشہ تندرست رہو گے

کبھی بیمار نہ ہو گے'

ہمیشہ زندہ رہو گے

کبھی نہ مرو گے'

ہمیشہ خوش حال رہو گے

کبھی خستہ حال نہ ہو گے'

ہمیشہ جوان رہو گے

کبھی بوڑھے نہ ہو گے

(مسلم بہ روایت ابو ہریرہ و ابو سعید خدری)

پھر کیوں نہ سب کوششیں اس زندگی کے لیے کی جائیں؟

(خیر خواہ)

تزکیہ و تربیت

تمنائیں

ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

خواہشات، آرزوئیں، تمنائیں اور امیدیں ـــــ انسانی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ کبھی کبھی انسان ایسی ایسی خواہشات اور ایسی ایسی تمنائیں اور آرزوئیں اپنے دل میں رکھتا اور زبان پہ لاتا ہے کہ جن کا بظاہر پورا ہونا محال نظر آتا ہے۔ ایک مومن کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کس قسم کی امیدیں، آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ رکھ سکتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

جی ہاں! مسلمان کو زندہ تمنا ہی کی ضرورت ہے۔ ایک مسلمان اپنی زندگی میں بے شمار تمنائیں رکھتا ہے، کافر بھی تمناؤں سے خالی نہیں مگر دونوں کی تمناؤں میں بڑا فرق ہے۔ ایک مسلمان ایسے مستقبل کی تمنا کرتا ہے جو اس کی دنیا و آخرت کے لیے مفید ہو۔ اس کی ایک فطری تمنا، حصول جنت و مافیہا اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ ایک مسلمان کی آرزوئیں کتاب و سنت کے تابع ہوں تو یقیناً اسے دنیا و آخرت کی سرخروئی نصیب ہو گی۔

اس موضوع پر متقدمین علما نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اور سب نے اپنی تصانیف میں اس عنوان سے ابواب قائم کیے ہیں، مثلاً امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن عبید ابن ابی الدنیا بغدادی (م ۲۸۱ھ) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "المتمنین" (تمنا کرنے والے) رکھا ہے۔ امام بخاری (م ۲۵۶ھ) نے بخاری میں ایک فصل کتاب التمنی کے نام سے قائم کی ہے جس میں انیس حدیثیں تمنا سے متعلق بیان کی ہیں۔

تمنا، اردو میں عام استعمال ہوتا ہے، اصطلاحی اعتبار سے ابن حجر اور عینی کے مطابق اس کے معنی مستقبل سے متعلق ارادہ ہیں۔ تمنا کے ایک معنی تلاوت کے بھی ہیں مگر جب امنیہ کے طور پر استعمال ہو، جیسے قرآن کریم میں ہے: اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ۔ (الحج ۲۲:۵۲)۔ لغت کے امام الازہری فرماتے ہیں کہ تلاوت کو تمنا، تمنی یا امنیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ تلاوت کرنے والا جب کسی آیت رحمت کو پڑھتا

ہے تو وہ رحمت کے حصول کی تمنا کرتا ہے اور جب کسی عذاب کی آیت کو پڑھتا ہے تو عذاب سے بچنے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ تمنا کا اطلاق جھوٹ پر بھی ہوتا ہے کیونکہ دروغ گو اپنے دل میں ایک بات بناتا اور پھر اسے بیان کر دیتا ہے۔ اسی لیے جھوٹی حدیثوں کو "امانی" کہا جاتا ہے۔ کلام الٰہی سے بھی تمنا کے اس معنی کی تائید ہوتی ہے: وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ (البقرہ ۲:۷۸) "ان میں بعض ان پڑھ ہیں جو کتاب کا علم تو رکھتے نہیں، جھوٹی آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں"۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: (ما تمنيت منذ اسلمت) یعنی میں نے جب سے اسلام قبول کیا کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

تمنا کرنا ایک عمل مباح ہے بشرطیکہ کسی مذموم یا شرعاً ممنوع چیز کی تمنا نہ کی جائے۔ امام بخاری و ترمذی کے شیخ ابو عبید القاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تمنا کی اجازت منقول ہے جیسا کہ حدیث مبارکہ: اِذَا تَمَنّٰى اَحَدُكُمْ فَلْيُكْثِرْ فَاِنَّمَا يَسْاَلُ رَبَّهٗ "جب تم میں سے کوئی تمنا کرے یعنی اللہ سے مانگے تو بکثرت مانگے کیونکہ مانگنے والا جس سے مانگ رہا ہے، وہ اس کا رب ہے"۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو اپنے رب سے دنیا و آخرت کی بھلائی کی کوئی چیز طلب کرے چنانچہ اگر وہ کوئی بہت بڑی خواہش بھی ہو گی اور اس میں اللہ سے گڑگڑا کر سوال کرے گا تو جائز ہے کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے: وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ "اللہ سے اس کا فضل مانگو"۔

ایک حدیث ہے: اِذَا تَمَنّٰى اَحَدُكُمْ فَلْيَنْظُرْ مَا يَتَمَنّٰى فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِىْ مَا يُكْتَبُ لَهٗ مِنْ اُمْنِيَّتِهٖ "جب تم میں سے کوئی شخص تمنا کرے تو دیکھ لے کہ وہ کس چیز کی تمنا کر رہا ہے کیونکہ اسے نہیں معلوم کہ اس کی تمنا میں اسے کیا مل جائے"۔

رہا معاملہ اس حکم خداوندی کا جس میں تمنا سے ممانعت پائی جاتی ہے یعنی یہ آیت مبارکہ: وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ (النساء ۴:۳۲) "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو"۔ اس سے مراد ایسی تمنا کی ممانعت ہے جس میں کسی کو حاصل شدہ نعمتوں کے زوال کی تمنا ہو، کیونکہ یہ حسد کی کیفیت ہے۔

تمنا کی اقسام

تمنا کی دو قسمیں ہیں: ایک تو تمنائے محمود (یعنی پسندیدہ و جائز) اور دوسری تمنائے مذموم (یعنی ناپسندیدہ و ناجائز)۔ بعض علما نے اس کی ایک تیسری قسم کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ابن الجوزی نے تمنا پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمنا کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان یہ تمنا کرے کہ اسے کسی دوسرے کا مال مل جائے اور وہ دوسرا اس مال سے محروم ہو جائے۔ یہ حسد ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ کوئی انسان یہ تمنا کرے کہ اسے بھی فلاں شخص کی طرح مال مل جائے، مگر اس شخص کا مال بھی اس کے پاس

رہے' یہ رشک ہے۔ اور تیسری قسم یہ ہے کہ کوئی عورت مرد ہونے کی یا مرد عورت ہونے کی تمنا کرے۔ انسان کا اللہ کے اس فیصلے یا قضا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسے چاہیے کہ دنیا و آخرت کی کوئی اور بھلائی مانگے۔

ہم اپنی تمناؤں کے لیے احادیث سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۔ **قرآن اور علم کی تمنا:** حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "دو باتوں کے سوا حسد (رشک) روا نہیں' ایک تو ایسا شخص جسے اللہ نے قرآن کی دولت بخشی ہو اور وہ رات دن اس کی تلاوت کرتا ہو' ایسے شخص کو دیکھ کر یہ آرزو کی جا سکتی ہے کہ اگر مجھے بھی اس کی طرح (حفظ) قرآن کی دولت میسر آئے تو میں بھی اسی طرح اس کی تلاوت کروں جیسے یہ کر رہا ہے"۔ یہاں حسد سے مراد رشک ہے جسے حسد محمود کہا جاتا ہے اور جس میں کسی دوسرے کو میسر نعمتوں کے زوال کی خواہش نہیں ہوتی' بلکہ اپنے لیے اس جیسی نعمتوں کی خواہش ہوتی ہے۔

۲۔ **مال عطا کرنے کی تمنا:** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "میرے پاس کچھ نہ ہو' ماسوائے اس کے جو میں قرض کی ادائگی کے لیے رکھ لوں' جب کہ اسے قبول کرنے والے مجھے مل جائیں"۔

۳۔ **شہادت کی تمنا:** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ راہ خدا میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں...."

امام نووی فرماتے ہیں اس حدیث میں شہادت اور بھلائی کی تمنا ہے اور ایک ایسی بھلائی کی آرزو ہے جو عادتاً پوری نہیں ہو سکتی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس میں ایسی آرزو کرنے کا جواز ہے جو کسی ایسی بھلائی کی ہو جس کا حصول بظاہر (اگرچہ) ناممکن ہی ہے۔ اور اگر ایسی شہادت کی تمنا کرے جس میں اسے حقیقی رغبت ہے تو یہ درست ہے۔ اس سلسلے میں مزید کئی احادیث بھی ملتی ہیں ان میں سے ایک حضرت انسؓ سے مروی ہے: مَنْ طَلَبَ الشَّهَادَةَ صَادِقًا أُعْطِيَهَا وَلَوْ لَمْ يُصِبْهَا (مسلم) "جو شخص سچے دل سے شہادت کی آرزو کرے اسے اس کا اجر مل جائے گا اگرچہ وہ شہادت نہ پائے"۔

۴۔ **بار بار شہادت کی تمنا:** حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی بھی شخص جسے جنت مل گئی ہو گی وہ دنیا میں واپسی کی خواہش نہ کرے گا۔ ماسوا شہید کے کہ اس کے دل میں مرتبہ شہادت کی جو عظمت پیدا ہو چکی ہو گی' اس کی بنا پر وہ چاہے گا کہ وہ دس بار دنیا میں جائے اور ہر بار شہادت پا کر لوٹے"۔

۵۔ **مغفرت کی تمنا:** حضرت عوف بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرمؐ نے ایک جنازے پر یہ دعا پڑھی جسے میں نے یاد کر لیا اور وہ دعا یہ تھی: "اے اللہ! اس کی مغفرت فرما، اس پر رحم فرما، اس کو عافیت میں رکھ، اور اس کو معاف فرما۔ اس کی عزت کے ساتھ مہمانی کر، اس کے مدخل کو (قبر) وسیع کر، اس کو پانی، برف اولوں سے دھو ڈال، اس کو گناہوں سے اس طرح صاف کر دے جس طرح سفید کپڑے کو میل سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے دنیاوی گھر کے بدلے میں بہتر گھر والے عطا فرما اس کو جنت میں داخل فرما، اس کو عذاب قبر اور عذاب نار سے محفوظ رکھ"۔

۶۔ **جنت میں حضورؐ کا ساتھ پانے کی تمنا:** ربیعہ بن کعب اسلمیؓ کہتے ہیں: میں نبی اکرمؐ کے ساتھ رات گزارا کرتا تھا اور حضورؐ کو ضرورت کے وقت وضو کا پانی پیش کیا کرتا، ایک بار جو میں نے پانی پیش کیا تو حضورؐ نے فرمایا: "مانگو کیا مانگتے ہو، میں نے کہا جنت میں آپ کا ساتھ مانگتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اس کے علاوہ کچھ اور، میں نے کہا بس یہی۔ حضورؐ نے فرمایا تو پھر سجدوں میں کثرت سے میری مدد کرو"۔

۷۔ **جنت میں فقرا کے ساتھ داخلے کی تمنا:** حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "مہاجرین فقرا کو خوش خبری ہو کہ اللہ نے انھیں سرخرو فرمایا ہے کہ وہ اغنیا سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے"۔ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے، حضرت عبداللہ کہتے ہیں مجھے بھی یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش میں بھی ان میں سے ہوتا یا ان کے ساتھ ہوتا۔

۸۔ **اہل جنت کی تمنا:** ہمام بن منبہ سے مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے ہمیں یہ بتایا کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: "جنت میں تم میں سے کم تر درجے کے جنتی سے کہا جائے گا مانگو یا اپنی آرزو پیش کرو تو وہ اپنی آرزوئیں بیان کرنے لگے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے بس تم نے مانگ لیا جو مانگنا تھا، وہ کہے گا ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اچھا تو جو کچھ بھی تم نے مانگا اور اتنا مزید تمھیں عطا کرتے ہیں"۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس سے کہا جائے گا جو تم نے مانگا وہ اور اس سے دس گنا ہم نے تمھیں دیا۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ "جنت میں کم تر مرتبے والا شخص بھی ایسا ہو گا کہ وہ اللہ سے مانگے گا تو اس سے کہا جائے گا جو تم نے مانگا ہم نے دیا اور اتنا ہی مزید بھی، سو اب تم یوں اور یوں اور یوں مانگو اور یہ سب اور اتنا ہی مزید تمھیں دیا جائے گا"۔

۹۔ **گناہ میں ملوث ہونے سے بچنے کی تمنا:** حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ہمیں قبیلہ جہینہ کی طرف بھیجا۔ چنانچہ ہم نے صبح سویرے جا حملہ کیا اور ان کو شکست سے دوچار کر دیا۔ پھر فرماتے ہیں: میں اور میرے ایک انصاری ساتھی نے ایک شخص کو پکڑا اور جب ہم نے اسے پچھاڑ لیا تو

اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا چنانچہ میرے ساتھی نے اسے چھوڑ دیا مگر میں نے اپنے خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ جب ہم واپس آئے تو نبی کریمؐ سے یہ ماجرا بیان کیا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا: "اسامہ! تم نے اسے کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا؟ میں نے عرض کی یا رسولؐ اللہ! اس نے تو جان بچانے کے لیے کلمہ پڑھا۔ حضورؐ نے (پھر) فرمایا: تم نے اسے کلمہ پڑھنے کے باوجود قتل کر دیا؟" حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ بار بار یہ بات دہراتے رہے یہاں تک کہ میں یہ آرزو کرنے لگا کہ کاش اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں اس وقت تک مسلمان نہ ہوا ہوتا۔

۱۰۔ **امن کی تمنا کرنا:** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک رات نبی اکرمؐ آرام نہ فرما سکے اور آپؐ نے فرمایا: "کاش آج رات میرے ساتھیوں میں سے کوئی اللہ کا نیک بندہ ایسا ہوتا جو رات بھر میری پہرہ داری کرتا"۔ ہم نے اسلحہ بجنے کی آواز سنی۔ یہ حضرت سعدؓ تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کون؟ کہا میں سعد ہوں، آپ کی پہرہ داری کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ محو استراحت ہوئے یہاں تک کہ ہم نے آپ کے خراٹوں کی آواز سنی۔

انسانی شخصیت کی تعمیر میں تمناؤں کی اپنی اہمیت ہے۔ دل کی زندگی تمناؤں سے ہی ہے۔ جس دل میں تمنا نہیں، وہ دل مردہ ہے۔ نیک انسانوں کی تمنائیں بھی نیک ہوتی ہیں۔ انسان اپنی تمناؤں کا جائزہ لے کر خود دیکھ سکتا ہے کہ وہ کس مقام پر ہے۔ دعاؤں کے ذریعے اچھی تمناؤں کی ترغیب اور تربیت دی گئی ہے۔ قرآنی اور نبوی دعاؤں میں جو کچھ مانگا گیا ہے، ان کو ہمیں اپنی تمناؤں کا محور بنا لینا چاہیے۔ انسان اپنی تمناؤں کے لیے ہی کوشش کرتا ہے۔ تمنا کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ جاتا۔ انسان کی زندگی کی ساری جدوجہد اپنی حقیقی تمنا کے لیے ہوتی ہے۔ جس کی تمنا رضائے الٰہی ہے، اس کی سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی کا حصول ہی ہو گا۔ دنیا میں اچھی زندگی کی تمنا بھی مطلوب و محمود ہے اور اس کے لیے کوشش حسن نیت کے ساتھ ہو تو باعث اجر بھی ہے۔ شیطان کا حربہ یہ ہے کہ وہ انسان کو جھوٹی تمناؤں سے شکار کرتا ہے اور ان کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ مومن اپنے آپ کو اس سے بچاتا ہے۔ اچھی تمنائیں رکھتا ہے، اور اللہ سے انھیں پورا کرنے کی امید رکھتا ہے۔ ان کے لیے دعائیں کرتا ہے اور کوشش بھی کرتا ہے۔

ایک گذارش

ترجمان القرآن، جنوری ۹۱ --- دسمبر ۹۱، جنوری ۹۲ --- دسمبر ۹۲ اور جنوری ۹۳ --- دسمبر ۹۳ کے شمارے درکار ہیں۔ جو حضرات فراہم کر سکتے ہوں، وہ دفتر ترجمان القرآن سے رابطہ کریں۔

رابطہ: مینجر، ترجمان القرآن ۵، اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

عمرو بن العاصؓ نے فرمایا' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ :

"آدمی کا دل ہر وادی میں بھٹکتا رہتا ہے' تو جو شخص اپنے دل کو وادیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا تو اللہ کو پروا نہ ہو گی کہ اس کو کون سی وادی تباہ کرتی ہے' ---- اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا' اللہ تعالیٰ اس کو ان وادیوں اور راستوں میں بھٹکنے اور تباہ ہونے سے بچائے گا"۔

(ابن ماجہ)

23

اسلام میں غیر جانب داری کا تصور۔۱

محمود احمد غازی

اسلام کے بین الاقوامی قانون کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں بعض غیر مسلم مصنفین کی تحریروں سے پیدا ہوئی ہیں۔ مستشرقین کے اس رویے اور فکر سے دنیاے اسلام میں بہت سے لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ ان غلط فہمیوں میں سے ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلام جنگ و جدل کا پیغام ہے جس کا مقصد خود بھی مسلسل جنگ و جدل میں مبتلا رہنا اور دنیا کو بھی اس جدال میں مبتلا رکھنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام وہ پہلا پیغام ہے جس نے قوت کے استعمال کو نتیجہ خیز اور موثر طور پر اخلاقی ضابطوں کا پابند بنایا ہے' جس نے ریاستوں کے تعلقات کو ایک ایسے اخلاقی نظام کے ذریعے استوار کیا ہے جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ غلط فہمیوں کے اس سلسلے کا ایک شاخسانہ اسلام کے تصور غیر جانب داری کے بارے میں بعض بے بنیاد تصورات بھی ہیں۔ ان حضرات کی تحریروں میں اسلام کے بارے میں بار بار یہ کہا گیا ہے کہ اسلام میں پرامن بقاے باہمی کا کوئی بین الاقوامی تصور موجود نہیں ہے اور اسلامی ریاست کسی دوسری غیر مسلم ریاست کے بارے میں پرامن بقاے باہمی کا نہ کوئی واضح تصور رکھتی ہے اور نہ اس کے پاس ایسا کوئی پروگرام موجود ہے' لہٰذا دنیاے اسلام کے تعلقات غیر اسلامی دنیا سے جب اور جہاں بھی ہوں گے وہ سب جنگ و جدل پر ہی مبنی ہوں گے۔ یہ تصور بہت سے مغربی مصنفین نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ قدیم مغربی مصنفین کے ہاں بھی اور جدید مغربی مصنفین کے ہاں بھی یہ بات مختلف انداز اور پیرایوں میں دہرائی گئی ہے۔ حتیٰ کہ بعض مشرقی غیر مسلم اہل علم بھی اس تکرار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مثال کے طور پر مشہور عراقی مسیحی مصنف مجید خدوری نے آج سے تیس سال پہلے اپنی کتاب War and Peace in the Law of Islam میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام میں تعلقات کی بنیاد جنگ ہے اور امن اور صلح ایک عارضی چیز ہے جو دو جنگوں کے درمیانی وقفے سے عبارت ہے۔ مصنف نے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے فقہ اسلامی سے' احادیث سے اور قرآن سے ایسے اقتباسات جمع کیے ہیں جن سے یہ مفہوم نکالا جا سکے اور اس مواد کو اس طرح سے مرتب کر کے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے یہ بات خود بخود آ جائے

کہ واقعی اسلام میں پرامن بقاے باہمی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

جب ہم اسلام کے تصور جنگ اور تصور جہاد کو اپنی کتابوں میں اور اس کے صحیح پس منظر میں دیکھتے ہیں تو یہ دعویٰ واضح طور پر غلط ٹھہرتا ہے۔ فقہاے اسلام نے تصور جنگ اور تصور جہاد پر بحث کرتے ہوئے جو تفصیلی احکام مدون کیے ہیں ان سے غیر جانب داری کا اسلامی تصور نمایاں طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ خود عہد نبویؐ اور عہد خلفاے راشدین میں غیر جانب دارانہ تعلقات کے واقعات ملتے ہیں جن کی طرف واضح اشارے قرآن پاک اور سیرت نبویؐ میں موجود ہیں اور جن کے احکام فقہاے اسلام کی بیان کردہ تفصیلات میں موجود ہیں۔

جہاں تک مجرد اس تصور کا تعلق ہے کہ دو متحارب فریقوں کے درمیان ایک تیسرا فریق غیر جانب دار ہو، دونوں کے باہمی محاربے سے اس کا کوئی مثبت یا منفی تعلق نہ ہو، دونوں کے ساتھ اس کے پرامن تعلقات یکساں طور پر پائے جاتے ہوں اور دونوں میں سے کسی ایک کی جنگی اور عسکری طور پر مدد کرنے سے وہ احتراز کرتا ہو، یہ تصور بہت قدیم ہے اور اتنا ہی پرانا ہے جتنی خود جنگوں کی تاریخ پرانی ہے۔ لیکن جہاں تک غیر جانب داری کے اس جدید تصور کا تعلق ہے جو بین الاقوامی قانون میں ایک اصول بلکہ شعبے کی حیثیت سے گذشتہ سو سال سے متعارف ہوا ہے تو یہ تصور خود مغرب میں بھی زیادہ پرانا نہیں ہے۔ مغرب میں اس کی عمر سو یا ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ ڈیڑھ سو سال قبل جب مغربی مصنفین نے اس تصور کو قانون کی کتابوں اور دیگر تحریروں میں بیان کرنا شروع کیا تو ان کے ذہنوں میں ایک مبہم سا تصور بھی اس بات کا موجود نہ تھا کہ اس غیر جانب داری کے اصول و قوانین کیا ہوں گے اور کن احکام و قواعد کے تحت غیر جانب دارانہ تعلقات کو منظم و منضبط کیا جائے گا۔ غیر جانب داری کے تفصیلی اصول و قوانین مغرب میں بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے اوائل کی بات ہے کہ جب مختلف مغربی طاقتوں کی باہمی پیکار اور مسلسل کش مکش سے (جو دراصل استعماری مفادات کی باہمی آویزش کا شاخسانہ تھی) غیر جانب داری پر کاربند رہنے والے ممالک کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے قواعد وضع کرائیں۔ چنانچہ اس غرض کے لیے باقاعدہ قانون اور ضابطہ مرتب کیا گیا۔

۱۹۰۷ میں یعنی آج سے تقریباً ۸۸ سال پہلے یورپ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ دی ہیگ میں (جہاں آج بین الاقوامی عدالت انصاف کا دفتر ہے) ایک کنونشن منعقد کیا گیا جس میں یورپ کے مختلف ممالک کے قانون دانوں اور نمایندوں نے سر جوڑ کر یورپ کے ممالک کے باہمی محاربانہ تعلقات اور سیاسی کشاکش میں غیر جانب داری کے تصور کو مرتب کیا۔ اس دستاویز کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا تعلق صرف یورپ کے ممالک کے باہمی تعلقات سے ہے۔ دستاویز کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ جب یورپ کے دو

ملک آپس میں لڑائی کریں یا ان میں آپس میں محاربانہ آویزش ہو اور کوئی تیسرا یا چوتھا ملک غیر جانب دار رہنا چاہے تو وہ کن اصولوں اور قواعد و احکام کے تحت غیر جانب دار رہے' اور اس غیر جانب داری کے اصول و ضوابط کیا ہوں جو ان غیر جانب دار قوتوں کے مفادات و مصالح اور باہمی تعلقات کو منضبط کر سکیں۔ اس دستاویز نے یورپ سے باہر کسی مسلم یا غیر مسلم ملک کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ غیر جانب داری کے اس نئے تصور کے تحت کوئی ایسا حق رکھنے کا دعویٰ کر سکے جو یورپ کے ممالک کو حاصل ہے۔ گویا اس غیر جانب داری کے تحت کسی غیر یورپی حکومت کا نہ کوئی استحقاق تھا نہ مراعات تھیں۔

آج یورپ میں قواعد کے جس مجموعے کو بین الاقوامی قانون کہا جاتا ہے وہ اپنی اصل کے اعتبار سے صرف یورپین قانون ہے۔ وہ ابتداً صرف مغربی ممالک کے تعلقات کو منظم اور منضبط کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی مشہور کتابوں اور تعبیرات میں متعدد بار اس بات کا اظہار بھی کیا گیا کہ اس قانون کا تعلق یورپ کی مسیحی مملکتوں کے باہمی تعلقات سے ہے اور اس کا ہدف ان مملکتوں کے تعلقات کو ہی مرتب کرنا ہے۔ اس کا غیر یورپین یا غیر مسیحی ممالک سے کوئی تعلق نہیں۔ کئی سو سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد ۱۸۵۶ میں پہلی بار ترکی کو اور ۱۹۰۵ میں جاپان کو اس قانون کے تحت مراعات یافتہ مملکت تسلیم کیا گیا۔ یہی کیفیت غیر جانب داری کے تصور کی بھی رہی ہے۔ ۱۹۰۷ میں جب پہلی بار غیر جانب داری کے اصولوں کو قانون کے طور پر مرتب کیا گیا اور اس کے لیے تفصیلی قواعد و ضوابط تیار کیے گئے تو ان قواعد و ضوابط کا انطباق صرف مغربی طاقتوں پر کیا گیا اور کسی غیر یورپی اور غیر مسیحی طاقت بشمول ترکی کو جو یورپ کا ایک حصہ تھا اور ہے اس بات کا مستحق نہیں گردانا گیا کہ وہ غیر جانب داری کے ان قوانین کے تحت مراعات کا مستحق ہو۔

اس کے مقابلے میں قرآن پاک نے ابتدا سے ہی غیر جانب داری کا دائمی اور وسیع الانطباق اصول فراہم کیا۔ اس اصول سے دنیا کا ہر وہ ملک جو پرامن بقاے باہمی پر مبنی تعلقات چاہتا ہو اور متحاربین کے درمیان برابری اور مساوات کی بنا پر اپنی غیر جانب دارانہ حیثیت اور پوزیشن کو قائم رکھنا چاہتا ہو' یکساں طور پر متمتع ہو سکتا ہے۔ وہ عدل و انصاف کی بنیاد پر مسلمانوں سے معاملہ کر سکتا ہے۔ اس کے تعلقات پرامن بقاے باہمی کی بنیاد پر کسی بھی مسلم اسٹیٹ سے قائم ہو سکتے ہیں جس کی ماضی میں متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ اس اصول غیر جانب داری کی تفصیلات میں' جو فقہاے کرام نے ترتیب دی ہیں' محض جغرافیائی' نسلی یا مذہبی بنیادوں پر کسی تفریق کو کہیں بھی روا نہیں رکھا گیا۔ نہ اس میں علاقے یا زبان کی تفریق کو بنیاد بنایا گیا۔

۱۹۰۷ میں دی ہیگ میں جو قانون غیر جانب داری مرتب کیا گیا' اس میں جو قوانین وضع کیے گئے دو بنیادوں پر قائم تھے' اور آج بھی مغرب میں غیر جانب داری کا سارا تصور انھی دو بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں

سے ایک بنیاد تو یہ ہے کہ جو ریاست غیر جانب داری کا دعویٰ کرتی ہے وہ اپنی حاکمیت کے تحفظ کا پورا پورا حق رکھتی ہے اور غیر جانب داری کے یہ معنی نہیں لیے جائیں گے کہ اس کی حاکمیت کو نظرانداز کر دیا جائے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ جو دو متحارب قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں ان کے باہمی حربی معاملات سے یہ غیر جانب دار ریاست مکمل طور پر علیحدہ اور لاتعلق رہے گی۔ دونوں میں سے کوئی فریق اس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک فریق کی مدد کرے یا اس کو ایسی سہولتیں فراہم کرے جس کا فائدہ اس کو یا اس کا نقصان دوسرے فریق کو پہنچ سکتا ہو۔ یہ وہ دو بنیادیں تھیں جن پر مغرب میں غیر جانب داری کا تصور استوار کیا گیا۔ ان میں سرے سے عدل و انصاف کے تقاضوں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ دونوں متحارب ریاستوں میں کون ظالم ہے اور کون مظلوم' کون حق پر ہے اور کون باطل پر' یہ طے کرنا یا اس بحث میں پڑنا غیر جانب دار ریاست کا دردِ سر نہیں۔ حالانکہ یہ بلاواسطہ ظالم کی مدد کرنے کے مترادف ہے' جس کے دردناک مناظر آج مسلمان بوسنیا اور چیچنیا میں شب و روز دیکھ رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں (جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے) قرآن پاک میں جو ہدایات دی گئیں ان میں غیر جانب دار فریقوں کے ساتھ نہ صرف پرامن بقائے باہمی کا اصول دیا گیا بلکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کے عالمگیر ابدی اصول کے مطابق اقدامات کرنے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی ہدایات بھی دی گئیں۔ مزید برآں قرآن پاک کی مشہور اور عام اصطلاح' بر کے اصول کے مطابق ان سے معاملہ کرنے کی ترغیب بھی دی گئی۔

آج کل غیر جانب داری کے تصور کو ماہرین قانون نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ پہلی بار انھوں نے ہی دنیا کو اس تقسیم سے متعارف کرایا ہے۔ ایک' مکمل غیر جانب داری اور دوسرے' شبہ غیر جانب داری یا نیم غیر جانب داری (quasi - neutrality) جس میں متعلقہ ریاست مکمل طور پر غیر جانب دار نہیں ہوتی' لیکن اس حد تک وہ ضرور غیر جانب دار رہتی ہے کہ وہ کسی ایک فریق کو حربی مدد فراہم نہ کرے۔ اس میں ہر قسم کی حربی مدد شامل ہے چاہے وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ' اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کسی فریق کی فوج کو گزرگاہ بھی فراہم نہ کرے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری نوعیت کی مدد اور تعاون وہ فراہم کر سکتی ہے' چاہے وہ مدد آگے چل کر حربی اقدامات میں مدد دے۔

جب ہم اسلام کے تصور غیر جانب داری کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہیے جو بہت سے مغربی مصنفین نے جان بوجھ کر پیدا کی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام میں کثیر العناصر معاشرے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے یعنی اسلام کسی Pluralistic Society کا تصور اپنے اندر نہیں رکھتا۔ بلکہ ان حضرات کے خیال میں اسلام اپنے فکر و عمل اور تاریخی تجربے کے اعتبار سے ایک خالص یک عنصری معاشرہ (Monolithic Society) رکھتا ہے جس میں صرف

ایک قوم اور ایک امت پائی جاتی ہے' اور دوسرے تمام لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں جنھیں کوئی آزاد اور خود مختار حیثیت حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ تاثر خاصا منفی اور بہت حد تک غلط فہمی (دانستہ یا نادانستہ) پر مبنی ہے۔ اس سوال کا کہ کیا اسلام کے نظام میں کسی کثیر العناصر معاشرے کی گنجایش ہے' دو پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب و نظریات کے ماننے والوں کو کس حد تک حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ اسلام کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام نے اہل ذمہ اور دوسرے غیر مسلم افراد کو اپنے معاشرے میں کیا کیا مراعات دی ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ جو معاہدے کیے ان میں غیر مسلموں کو کیا کیا حقوق دیے گئے اور کیا کیا مراعات دی گئیں؟ پھر آپؐ نے ان حقوق و مراعات کا کیسے تحفظ فرمایا اور ان کو ان حقوق کے تحفظ کے لیے کیا کیا ضمانتیں دیں۔ پھر فقہاے اسلام نے کس طرح ان کے مذہبی اور دیگر حقوق کی تفصیلات مدون کیں اور ائمہ اسلام نے کس طرح حکمرانوں کے خلاف کھڑے ہو کر ان حقوق کو منوایا۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی حدود سے باہر بین الاقوامی سطح پر اسلامی ریاست دوسری ایسی ریاستوں کا وجود کھلے دل سے تسلیم کرتی ہے جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب کی پیروکار ہوں' جن کا نظام قانون اور دستور' اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب یا تصور پر مبنی ہو اور ان کے ساتھ اسلامی ریاست کا تعلق ایک پر امن اور مسلسل بقاے باہمی کا ہو۔

اس سوال پر جب ہم قرآن پاک کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ قرآن پاک نے ایک عمومی اور اصولی ہدایت مسلمانوں کو دی ہے' اور وہ ہدایت یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جن قوموں سے تعلقات قائم کیے جائیں وہ شہری ریاستیں ہوں' قبائل ہوں' یا آج کل کے دور کی بڑی بڑی ریاستیں ہوں یا آیندہ آنے والی اس سے مختلف انداز کی ریاستیں ہوں' ان سب کے درمیان تعلقات کو اس اصول کی بنا پر قائم کیا جائے گا جو سورہ ممتحنہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت میں بتایا گیا ہے کہ دوستانہ بین الاقوامی اور بین الملکی تعلقات کے نقطہ نظر سے غیر مسلموں کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: مخالفین اور غیر مخالفین۔ یہاں مخالفین سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اللہ کے راستے پر چلنے سے روکا ہو' انھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھربار سے نکالا ہو' مسلمانوں پر جنگیں مسلط کی ہوں' ان کے جان و مال کو تباہ و برباد کر دیا ہو' ان کی عزتیں لوٹی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے کھلے دشمنان انسانیت سے دوستی اور پر امن بقاے باہمی کی بات کرنا منافقت اور بے غیرتی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ آج کے سیاق و سباق میں بوسنیا کے سربوں اور برما کے بدھوں کی مثال اس ضمن میں دی جا سکتی ہے۔

دوسرا گروہ غیر مخالفین کا ہے۔ اس سے مراد غیر مسلموں کا وہ گروہ ہے جنھوں نے مسلمانوں کو گھروں سے نکالا، نہ مسلمانوں کو پریشان کیا نہ ان کے دین کے سلسلے میں رخنہ ڈالا اور نہ مسلمانوں سے اس انداز کی دشمنیاں کیں جیسی آج دنیا کے بعض حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ کی جا رہی ہیں۔ یہ دوسرا گروہ ہے جس کے بارے میں قرآن پاک کی واضح ہدایات یہ ہیں: جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تمھیں پریشان نہیں کیا اور تم سے مقاتلہ و مقابلہ نہیں کیا، تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا، اللہ تعالیٰ تم کو اس سے نہیں روکتا کہ تم ان سے بر کا معاملہ رکھو، یعنی نیکی کرو اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کے ساتھ معاملہ کرو۔ ان کے ساتھ جو بہتر سے بہتر معاملہ کرنا چاہو، وہ کرو۔

بر قرآن پاک کی ایک جامع اور معروف اصطلاح ہے جس میں معاشرتی بھلائیوں کا ایک ایسا جامع نقشہ دیا گیا ہے، جس میں رفاہی معاشرے کے سارے پہلو شامل ہیں۔ سورہ بقرہ میں ایک جگہ اس بر کے بہت سے پہلو ذکر کیے گئے ہیں۔ اس آیت سے صاف پتا چلتا ہے کہ معاشرتی سطح پر انسانوں کی فلاح و بہبود کے تمام اقدامات بر میں شامل ہیں۔

ایک بنیادی اصول تو قرآن پاک نے یہ بیان کیا، لیکن اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس اصول کی عملی تفسیر مشکل اور تطبیق ناقابل عمل ہے اس لیے کہ مذکورہ بالا شرائط پر پوری اترنے والی غیر مسلم ریاستیں کم ہوں گی۔ لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ علاوہ نظری پہلو کے عملاً بھی تاریخ اسلام میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ صدر اسلام میں مسلمانوں کے جن لوگوں سے تعلقات رہے اور جن اقوام سے لین دین ہوا، ان میں سے متعدد اقوام اور ممالک ایسے تھے جن سے اس نوعیت کے تعلقات قائم ہوئے۔ تاہم اگر بالفرض کوئی ایسی قوم نہ بھی ہو اور مسلمانوں کے تعلقات اس ضمن میں دیگر اقوام سے محاربہ ہی کے رہے ہوں تو وہاں بھی یہ اصول صاف طور پر کار فرما دیکھا جا سکتا ہے، جیسا کہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ، مکہ کے قریشیوں کے ساتھ اور آزری ایرانیوں اور مصر کے قبطیوں کے ساتھ ہوتا رہا۔ علیٰ ہذا القیاس دوسری بہت سی اقوام سے آغاز میں یہی کوشش کی گئی کہ تعلقات کی نوعیت عدم محاربہ اور عدم مداخلت پر مبنی ہو، اسلامی دعوت کی نشرواشاعت میں رکاوٹ نہ ہو اور وہ کسی جنگی معاملے میں مسلمانوں کے کھلے دشمن کا ساتھ نہ دیں۔ قرب و جوار کے درجنوں قبائل سے (جو اس زمانے کے لحاظ سے شہری ریاستوں کی حیثیت کے حامل تھے) انھی خطوط پر معاہدے کیے گئے۔

جن قوموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات محاربے کے رہے ان سے بھی ایک مرحلہ ایسا پیش آ سکتا ہے کہ محاربہ کرنے والے محاربے سے الگ ہو جائیں اور واقعی ایک ایسا تعلق قائم ہو جائے جس کو پرامن تعلقات کے دور کی ابتدا کہا جا سکے۔ اس صورت میں معاہدوں کے ذریعے غیر جانب داری کی صورت پیدا کی

جا سکتی ہے۔ قرآن پاک نے اس کے لیے اعتزال کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے معنی الگ ہو جانے کے ہیں، فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا - (النساء ۴:۹۰) یعنی اگر لڑنے والے الگ ہو جائیں (اعتزال کے معنی ہیں دو متحارب فریقوں کے بارے میں کسی تیسرے فریق کا الگ رہنا) اگر وہ تمھاری اور تمھارے دشمنوں کے درمیان ہونے والی کش مکش سے الگ ہو جائیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمھارے ساتھ مسالمہ (باہمی امن و سلامتی) کے تعلقات رکھیں تو اللہ نے تمھیں ان کے خلاف جنگ کرنے کا اختیار نہیں دیا۔ اس سلسلے کی دوسری آیت اسی سلسلہ بیان میں یہ ہے کہ اگر وہ تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے باہمی محاربے سے الگ نہ ہوں اور تمھارے ساتھ سلامتی کے تعلقات قائم کرنے کی پیش کش نہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ کھینچیں تو پھر ان سے جنگ کرو اور جیسے اور جہاں موقع ملے ان کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔ ان لوگوں کے خلاف لڑنے کے لیے تم کو کھلی اجازت (سلطانا مبینا) حاصل ہے۔ سلطان مبین کے معنی مترجمین قرآن نے کھلی سند، صریح اجازت، صاف گرفت، صاف حجت وغیرہ کے کیے ہیں جس سے یہی پتا چلتا ہے کہ اس صورت میں ایسے لوگوں سے جنگ کرنے کی کھلی اور مکمل اجازت ہے۔

اس پورے سلسلہ بیان میں اعتزال کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ متحارب فریقین کے درمیان غیر جانب داری کے مفہوم میں آیا ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ اصول بن گیا کہ اگر کوئی ریاست مسلمانوں کے بارے میں غیر جانب دار رہنا چاہتی ہو، یعنی مسلمانوں کے اور غیر مسلموں کے محاربے میں الگ رہنا چاہتی ہو تو وہ ان تین شرائط کے ساتھ رہ سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرے، مسلمانوں کے دشمنوں سے الگ رہے اور مسلمانوں کے ساتھ پرامن تعلقات رکھے۔ ایک چوتھی شرط جو خود بخود مقدر (understood) ہے جس کے بارے میں دوسری نصوص میں واضح ہدایات ہیں وہ یہ کہ اس انتظام سے اسلام اور کلمۃ اللہ کی سربلندی پر زد نہ پڑے اور اسلام اور مسلمانوں کے وقار پر حرف نہ آئے۔ اگر یہ شرائط پوری ہوں تو پھر ان چیزوں کی پابندی ملحوظ رہے گی۔

یہ وہ دو بنیادی آیات ہیں جن سے فقہائے کرام نے غیر جانب داری کے اصول کی بابت استدلال کیا ہے۔ ان آیات کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے متعدد واقعات اور آپ کے کیے ہوئے کئی معاہدے ایسے ہیں جن سے بین الاقوامی تعلقات میں غیر جانب داری کی مزید تفصیلات ملتی ہیں اور جن کو انھی احکام و نظائر کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فقہائے کرام نے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں غیر جانب داری کے دیگر احکام مرتب کیے ہیں۔ قدیم فقہائے اسلام میں سے جن حضرات نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور جو اصول وضع کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی ریاست غیر جانب داری کے

باب میں کن کن اعتبارات (considerations) کو پیش نظر رکھے گی اور کن کن اصولوں پر کاربند ہو گی۔ اس سلسلے میں جب اعتزال کا لفظ احادیث میں تلاش کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ احادیث میں بھی یہ لفظ انھی اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی دو متحارب فریقوں کے مابین کسی تیسرے فریق کی پوزیشن اور اس کے تعلقات کی نوعیت ایسی ہونا کہ اس کو متحاربین کے آپس کے جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں۔ سنن ابوداؤد میں ابواب الفتن والملاحم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں کہ مسلمانوں میں فتنے اور اختلافات ہوں گے اور امت کو بے شمار فتنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ فتنوں کے اس دور میں آپ نے ان لوگوں کے طرز عمل کو پسندیدگی کی سند عطا فرمائی جو مسلمانوں کے آپس کے ان محاربوں سے الگ رہیں گے اور دونوں میں سے کسی ایک فریق کا ساتھ نہ دیں گے۔ یہ بھی اسی غیر جانب داری کی ایک قسم ہے جس کے لیے قرآن مجید میں اعتزال کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی نوعیت کے جو اندرونی اختلافات ہوں' انھیں بھی اعتزال یعنی غیر جانب داری قرار دیا گیا اور اس کو ایک مثبت اور قابل قبول رویے کے طور پر ذکر کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد کبار صحابہ مثلاً حضرت سعد ابن ابی وقاص؄ اور عبداللہ بن عمر؄ نے اس طرح کے اختلافات اور فتنوں کے دور میں غیر جانب داری کا رویہ اختیار کیا۔

تاہم اس سے پہلے ایک اور مثال غیر جانب داری کی ملتی ہے جو ہماری اس گفتگو کے سیاق و سباق میں ان مثالوں سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے۔ یہ گویا ایک مسلم ایڈمنسٹریشن کی غیر جانب داری کی مثال ہے۔ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہمارے سامنے ہے کہ جب وہاں طویل گفت و شنید کے بعد معاہدہ لکھا جا چکا تو اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی مسلمان جو مکہ سے مدینہ چلا جائے گا' اس کو مدینہ سے واپس کر دیا جائے گا اور اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ واپس آئے گا تو اسے قریش مکہ واپس نہ کریں گے۔ چنانچہ اس شرط کے مطابق مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے کے خواہشمند دو نوجوان صحابیوں ابوجندل اور ابوبصیر کو رسول اللہ نے ساتھ لے جانے سے معذرت کر دی۔ اس معاہدے کی رو سے انھیں حکم دیا کہ مکہ واپس چلے جائیں۔ اگرچہ بعض صحابہ کرام؄ کو ان حضرات کا یوں بے سہارا چھوڑا جانا خاصا گراں محسوس ہوا تھا۔ پھر جب رسول اللہ اس معاہدے کے بعد واپس مدینہ تشریف لائے تو ابوبصیر بھی کفار مکہ سے بھاگ کر مدینہ آ گئے۔ پیچھے کچھ لوگ مکہ سے ان کو لینے آ گئے۔ حضور؄ نے حسب معاہدہ یہاں سے بھی انھیں واپس کر دیا۔ لیکن ابوبصیر نے مکہ واپسی کے دوران دونوں میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا فرار ہو گیا۔ اب ابوبصیر نے مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ سے جو شخص بھی مسلمان ہو کر فرار ہوتا' وہ ابوبصیر کے ہاں آ جاتا۔ اس طرح کافی افراد اکٹھے ہو گئے' اب انھوں نے قریش مکہ کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ ان کارروائیوں کا رسول اللہ کو علم ہوتا رہا لیکن آپ؄ نے ان میں کوئی مداخلت نہ فرمائی۔ یہ تو

کہنا مشکل ہے کہ ابوبصیر کا یہ گروہ اور ان کا یہ علاقہ کوئی چھوٹی سی ریاست تھی، ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کوئی خود مختار علاقہ تھا لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ آزاد اور خود مختار گروہ تھا جو بہرحال مدینہ کی ریاست کا شہری نہیں تھا۔ مکہ کی شہریت کو یہ لوگ ترک (repudiate) کر چکے تھے۔ فقہا کی اصطلاح میں ان کو منعہ یعنی ایک قابل ذکر سیاسی تائید اور عسکری قوت حاصل تھی جو ان کی اپنی قوت تھی اور وہ اس قوت کی بنا پر اپنا دفاع خود کر سکتے تھے۔ انھوں نے کفار مکہ کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی لیکن مدینہ منورہ سے مسلمانوں نے انھیں کوئی مدد نہیں دی۔ اس طرح دونوں کے محاربے میں مدینہ کی اسلامی اسٹیٹ غیر جانب دار رہی۔

ان تمام مثالوں اور نصوص سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ غیر جانب داری کا ایک تصور اسلام میں موجود ہے جس کو بنیاد بنا کر دور جدید کے نئے مسائل و معاملات کے لیے تفصیلی احکام مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم اقلیتوں اور گروہوں کے معاملے میں ان مثالوں اور بالخصوص ابوبصیر کی مثال سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔ رسول اللہؐ کا یہ طرز عمل قرآن پاک کے اس اصول کے عین مطابق تھا: قوم بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (النساء ۴:۹۰)، (یعنی تم ایسی کسی قوم کے خلاف مسلم اقلیت کی مدد نہیں کر سکتے جس سے تمھارا معاہدہ موجود ہو)۔ اس واقعے سے یہ بھی پتا چلا کہ اگر کسی معاہد غیر مسلم ملک میں کوئی مسلم تنظیم اپنی آزادی کی مسلح جدوجہد کرے تو پڑوس کی اسلامی اسٹیٹ غیر جانب دار رہے گی۔ (جاری)

وہ صفات

جو جنت کا مستحق بناتی ہیں

۱- تقوی

۲- رجوع الی اللہ

۳- اللہ سے اپنے تعلق کی نگہداشت

۴- اللہ کو دیکھے بغیر اور اس کی رحیمی پر یقین رکھنے کے باوجود اس سے ڈرنا ، اور

۵- قلب منیب لیے ہوئے اللہ کے ہاں پہنچنا --- یعنی مرتے دم تک انابت کی روش پر قائم رہنا

(بندہ خدا)

تحریک اسلامی: چند اہم مسائل

حسن ترابی سے ایک انٹرویو

ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

ڈاکٹر حسن ترابی' تحریک اسلامی کے ممتاز رہنما ہیں جن کی قیادت میں سوڈان اسلامی نظام کے قیام کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ان کی فکر اور خیالات میں تجربے کا سبق بھی ہے۔ حال ہی میں اردن سے اشاعت کا آغاز کرنے والے رسالے' الامہ میں ان کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں تحریک کو درپیش اہم مسائل کے حوالے سے انھوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قارئین کے غور و فکر کے لیے ہم اس کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ ان کی رائے سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ انٹرویو لینے والے غسان ابو حسین ہیں۔ (مدیر)

س: اسلام کا سیاسی نظام نظریاتی مرحلے سے گزر کر بر سر زمین عمل در آمد کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ آپ نے بر سر اقتدار آنے سے پہلے جو لائحہ عمل بیان کیا تھا' اس میں اور اقتدار میں آنے کے بعد موجودہ صورت حال میں کافی فرق ہے۔ اسی طرح یقیناً موجودہ صورت حال اور آج سے سات سال بعد کی حالت میں بھی فرق ہو گا۔ ایسا کیوں ہے؟

ج: ہم نظری طور پر دین اسلام کو انسان کی انفرادی حیثیت میں یا اجتماعی طور پر اقتدار کے ایوانوں میں' دونوں صورتوں میں پوری زندگی کے لیے ایک عمومی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ ہمارے زمانہ قریب میں نفاذ اسلام کا کوئی ایسا عملی کام نہیں ہوا جس کو سامنے رکھ کر ہم اس کی پیروی کر سکیں' اور انھی حالات' آزمائشوں اور تقاضوں سے دوچار ہو کر وہی روش اختیار کریں۔ ایک طرف تو ہمارے سامنے موجودہ زمانے میں نظام اسلامی کے قیام کا کوئی نمونہ نہ تھا' دوسری طرف ہمارے پاس جو تحریری سرمایہ اور کتابیں ہیں وہ عملی میدان میں ہماری راہنمائی سے قاصر ہیں۔ کتابوں کی دنیا ہماری عملی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ایک پر آزمائش ماحول میں دینی اصولوں کو نافذ کرنے کا کام' عام حالات اور عام ماحول میں نفاذ شریعت سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم نے اپنے مطالعے کو عملی صورت دینا چاہی تو ہمیں کئی

دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا' ہمارے کام میں کئی خامیاں رہ گئیں اور ہمارے بہت سے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ ایک معاشرے کو دین پر قائم کرتے وقت عملی طور پر جن حقائق سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ روز مرہ کے حالات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے صدیوں سے اپنی کتابوں کو طاقِ نسیان کی زینت بنا رکھا ہے۔

ہم ایک اسلامی ریاست کے قیام پر ہونے والے عالمی ردعمل کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے۔ طاغوتی قوتیں اس پر شدید ردعمل کرتی ہیں خواہ اس سے انھیں نقصان نہ بھی پہنچتا ہو اور نہ ہی ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہو۔ ہم ان کے شدید ردعمل پر حیران رہ گئے۔ سامراجی طاقتیں تاریخ کا مسلسل مطالعہ کرتی ہیں اور اسلامی ریاست کے حوالے سے مستقبل کے متوقع خطرات کو مدنظر رکھتی ہیں۔

اب ہم زیادہ سمجھ دار اور معاملہ فہم ہو چکے ہیں۔ دین کے بارے میں ہماری فکر و فہم میں اضافہ ہوا ہے۔ اب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے سیاست و اقتدار کے تناظر میں سمجھتے ہیں اور تاویلات کی گھاٹیوں سے باآسانی گزر جاتے ہیں۔ ہمارے عوام ہمارے ساتھ ہیں' ان کے دلوں میں جذبہ جہاد و عمل ازسرنو زندہ ہو چکا ہے۔ ان میں مشورے' نصیحت اور خیرخواہی کے صالح جذبات امڈ آئے ہیں۔ ہم نے نصیحت' خیر خواہی اور مشورے کے میدان میں' معاشی میدان سے بھی زیادہ پیش رفت کی ہے۔ عقائد کے لیے مادیت' سیکولرازم سے بڑھ کر خطرناک ہے۔

تجرباتی سطح پر آکر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مالیات اور اقتصادیات کی قدیم فقہی کتابیں' موجودہ دور کی حقیقی صورت حال سے بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے سفر کی ابتدا ہے۔ ہنوز روز اول است۔

ہماری ایک نمایاں کامیابی' پورے معاشرے کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا اور پھر اس تبدیلی کو خواتین کا قبول کر لینا ہے۔ یہ بات تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ نفاذ اسلام سے پہلے ہمارے معاشرے میں بیچاری عورت کو یکسر نظرانداز کیا گیا تھا۔ اگر خدانخواستہ مغرب پرستوں نے اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی ہوتی' اس میں مرد کے خلاف نفرت پیدا کی ہوتی' اس میں تعصبات پیدا کیے ہوتے تو ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

ہم نے سوڈان میں درپیش تمام رکاوٹوں اور مزاحمتوں کا سامنا اسی جذبے سے کیا ہے جس سے ابتدائے اسلام میں مسلمانوں نے کیا تھا۔ سوڈان میں اسلام کا ایک روایتی سماجی تصور اور پس منظر رہا ہے۔ یہاں اسلام براہ راست نہیں آیا بلکہ صوفیانہ سلسلوں کے ذریعے پہنچا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے لیے اس روایتی مذہب پر دین کی عمارت کھڑی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم نے اسلام کی اصل تعلیمات کے ذریعے

روایتی مذہبی بنیادوں کو وسعت سے ہمکنار کر دیا۔

ہمیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ خود تحریک اسلامی ہمارے لیے کہیں خطرہ نہ بن جائے۔ ہم مسلم معاشرے میں کسی مخصوص تحریک کی گنجایش نہیں دیکھتے۔ آغاز اسلام میں کوئی مخصوص تحریک نہ تھی۔ آپؐ کے پاس آنے والے وہی ہوتے جو آپؐ کے دین کی طرف مائل ہوتے اور کفر کے ماحول سے بیزار ہو کر بارگاہ رسالتؐ میں پناہ لینے کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں تحریک اسلامی دیگر مذہبی گروہی اور صوفیانہ دھڑے بندیوں کی طرح کی ایک عصبیت نہ بن جائے، مگر الحمدللہ، ایسا نہیں ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سوڈان روایتی طور پر ایک "کھلا ملک" ہے۔ اس میں تمام روایتی فقہی مکاتیب فکر، مذاہب اور سلسلے پائے جاتے ہیں۔ شیعہ، سنی سب یہاں پر رہتے ہیں۔ ہم اس خطرے سے اس لیے بھی محفوظ رہے کہ تحریک اسلامی، الحمدللہ اپنے نام، اپنی قیادت، اپنے طریق کار، سب کو تبدیلیوں کے عمل اور تجربے سے گزرنے دینے کے لیے تیار ہے۔ غرضیکہ ہمارا ملک اور ہماری تحریک دونوں کھلے ہیں۔

ہماری خارجہ پالیسی ابھی تک واضح نہیں ہو سکی۔ اس بارے میں ہمیں وہ نئی باتیں پیش آئیں جو ہمارے گمان میں بھی نہ تھیں۔ ہم نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ہم ایک ایسے صحرا میں جس کے باشندے دین سے بیگانہ ہیں، جن سے اہل مغرب سخت عداوت و کینہ رکھتے ہیں، ہم وہاں ایک نخلستان قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ہم اپنی تحریک کا ناقدانہ نقطہ نظر سے معروضی جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ اپنی تحریک کو جادۂ حق پر قائم رکھنے کے لیے ہم نے عدل و انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا، خواہ اس سے خود ہم کو ہی نقصان کیوں نہ پہنچتا ہو۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تحریک سے باہر کے لوگ بھی ہماری نگرانی کریں، ہمارا محاسبہ کریں، ہمارا جائزہ لیں اور ہمارے حق میں اور ہمارے خلاف گواہ ٹھہریں۔

اب تو پوری دنیا سمٹ چکی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم سوڈان کے گرد کوئی آہنی دیوار کھڑی کر دیں اور اس کے بعد ہم وہاں نظام اسلام کی کاشت کریں اور جب اسلام کی فصل پک جائے تو پھر ہم اس دیوار کا پھاٹک کھول دیں۔ دین اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی کارکردگی کو کھلا رکھیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ لوگ آئیں، ہماری مدد کے لیے بڑھیں، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسے دیکھیں، ہماری غلطیوں کی نشاندہی کریں جو کچھ کم نہیں ہیں۔ ہماری اچھی باتوں کو سراہیں اور ان سے سبق لیں۔ ہماری اچھی کارکردگی بھی کچھ کم نہیں ہے۔

جب ہم صدرِ اول میں قیام اسلام کے اعلیٰ نمونوں کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں دکھ محسوس ہوتا ہے مگر جب ہم اپنا موازنہ اپنے اردگرد کے مسلم ممالک سے کرتے ہیں تو ہمیں قدرے فخر محسوس ہوتا ہے اور ہم اپنے طے کردہ راستے پر سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔

سے ایک بنیاد تو یہ ہے کہ جو ریاست غیر جانب داری کا دعویٰ کرتی ہے وہ اپنی حاکمیت کے تحفظ کا پورا پورا حق رکھتی ہے اور غیر جانب داری کے یہ معنی نہیں لیے جائیں گے کہ اس کی حاکمیت کو نظرانداز کر دیا جائے۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ جو دو متحارب قوتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں ان کے باہمی حربی معاملات سے یہ غیر جانب دار ریاست مکمل طور پر علیحدہ اور لاتعلق رہے گی۔ دونوں میں سے کوئی فریق اس سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک فریق کی مدد کرے یا اس کو ایسی سہولتیں فراہم کرے جس کا فائدہ اس کو یا اس کا نقصان دوسرے فریق کو پہنچ سکتا ہو۔ یہ وہ دو بنیادیں تھیں جن پر مغرب میں غیر جانب داری کا تصور استوار کیا گیا۔ ان میں سرے سے عدل و انصاف کے تقاضوں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ دونوں متحارب ریاستوں میں کون ظالم ہے اور کون مظلوم، کون حق پر ہے اور کون باطل پر، یہ طے کرنا یا اس بحث میں پڑنا غیر جانب دار ریاست کا درد سر نہیں۔ حالانکہ یہ بلاواسطہ ظالم کی مدد کرنے کے مترادف ہے، جس کے دردناک مناظر آج مسلمان بوسنیا اور چیچنیا میں شب و روز دیکھ رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں (جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے) قرآن پاک میں جو ہدایات دی گئیں اس میں غیر جانب دار فریقوں کے ساتھ نہ صرف پرامن بقائے باہمی کا اصول دیا گیا بلکہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کے عالمگیر ابدی اصول کے مطابق اقدامات کرنے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے کام کرنے کی ہدایات بھی دی گئیں۔ مزید برآں قرآن پاک کی مشہور اور عام اصطلاح، بر کے اصول کے مطابق ان سے معاملہ کرنے کی ترغیب بھی دی گئی۔

آج کل غیر جانب داری کے تصور کو ماہرین قانون نے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ پہلی بار انھوں نے ہی دنیا کو اس تقسیم سے متعارف کرایا ہے۔ ایک، مکمل غیر جانب داری اور دوسرے، شبہ غیر جانب داری یا نیم غیر جانب داری (quasi - neutrality) جس میں متعلقہ ریاست مکمل طور پر غیر جانب دار نہیں ہوتی، لیکن اس حد تک وہ ضرور غیر جانب دار رہتی ہے کہ وہ کسی ایک فریق کو حربی مدد فراہم نہ کرے۔ اس میں ہر قسم کی حربی مدد شامل ہے چاہے وہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کسی فریق کی فوج کو گزرگاہ بھی فراہم نہ کرے۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری نوعیت کی مدد اور تعاون وہ فراہم کر سکتی ہے، چاہے وہ مدد آگے چل کر حربی اقدامات میں مدد دے۔

جب ہم اسلام کے تصور غیر جانب داری کی بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا چاہیے جو بہت سے مغربی مصنفین نے جان بوجھ کر پیدا کی ہے اور آج بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلام میں کثیر العناصر معاشرے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے یعنی اسلام کسی Pluralistic Society کا تصور اپنے اندر نہیں رکھتا۔ بلکہ ان حضرات کے خیال میں اسلام اپنے فکر و عمل اور تاریخی تجربے کے اعتبار سے ایک خالص یک عنصری معاشرہ (Monolithic Society) رکھتا ہے جس میں صرف

سمجھتی کہ دین پر عمل نہیں کر رہا' یوں شیطان کو موقع مل جاتا' وہ حکمران کو ایک وادی میں لے جاتا اور رعایا کو دوسری وادی میں۔

ممکن تھا کہ ہمیں بھی فرقہ واریت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمارا معاشرہ' پارٹی بازی اور گروہ بندی کا شکار ہو کر بٹ جاتا۔ ایک طرف پیشہ ورانہ عصبیت ہوتی تو دوسری طرف مذہبی و سیاسی فرقہ بندی۔ ایک طرف فوجی ہوتے تو دوسری طرف شہری۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ہم فرقہ واریت سے سو فی صد "پاک" ہو چکے ہیں۔ تاہم میرا اپنا ایک خاص نقطہ نظر ہے کہ اگر تحریک اسلامی کو فرقہ واریت کا سامنا کرنا پڑے تو اسے اپنے دروازے آنے والوں کے لیے بند نہیں کر لینے چاہییں۔ آنے والوں سے ہم یہ نہیں کہتے' نہ کہہ سکتے ہیں کہ اب جب کہ اللہ کی نصرت و فتح آ چکی ہے' تم لوگ گروہ در گروہ منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو۔ تم لوگ مخلص نہیں ہو بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے منافقوں کی مانند ہو۔ تحریک اسلامی کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی اوچھی حرکتوں سے باز رہے ورنہ وہ اصولوں پر قائم تحریک کے بجائے ظاہری دین داری کی ایک بھونڈی شکل بن کے رہ جائے گی۔

سوڈان میں دین کے غلبے سے قبل یہ سارے اندیشے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی نے قوم کے تمام شعبوں میں نفوذ کا فیصلہ کیا کہ مبادا وہ صرف قوم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے تک محدود ہو کر رہ جائے' یا عورتوں کے بجائے صرف مردوں میں ہی پھیلے' یا شہری آبادی میں تو کام کرے اور دیہاتی آبادی کو نظرانداز کر دے' یا جوانوں کو اپنائے اور بوڑھوں سے صرف نظر کرے۔ ہم نے چاہا کہ تحریک اسلامی' امیروں' غریبوں' مردوں سب کو اپنے دامن میں لے تاکہ ملک میں توازن قائم ہو اور عصبیت سر نہ اٹھائے۔ الحمدللہ' ہماری اس منصوبہ بندی سے بہت فائدہ ہوا۔ اگر ہم نے یہ احتیاط نہ کی ہوتی تو ہم بھی فتنے سے دوچار ہو جاتے۔

س: آج سے ربع صدی قبل آپ نے فکر اسلامی میں تجدید کی دعوت دی تھی اور فقہ اسلامی کے اصولوں پر نظرثانی کا مطالبہ کیا تھا۔ اب آپ عملاً اسلامی نظام نافذ کر چکے ہیں تو اس سلسلے میں کیا پیش رفت کر پائے ہیں؟

ج: ایسا نہیں ہوا کہ ہمارا یہ تجربہ منتخب مجددین کا مخصوص مذہب بن کے رہ گیا ہو جو عوام سے الگ تھلگ اور کٹے ہوئے ہوں۔ دین میں عمل تجدید جاری و ساری رہتا ہے۔ اس بدیہی حقیقت سے ہمارے عوام تک واقف ہو چکے ہیں۔ وہ جان چکے ہیں کہ دین حرکت کا نام ہے۔ یہ قدم بہ قدم اور روز بروز ترقی و پیش قدمی کا نام ہے۔ دین نت نئے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ ہمارے عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام اپنے دامن میں جدت و وسعت لیے ہوئے ہے۔

ہمارا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ ہماری تحریک کی سرپرستی مجتہد علما کا ایک مختصر گروہ کر رہا ہے جو کلیسا کے پادریوں کی طرح ہیں۔ اگرچہ مذہبی پیشواؤں پر اندھا دھند اعتماد کی یہ بیماری' اہل مغرب کی طرح مسلمانوں کو

بھی لگ چکی ہے تاہم' اللہ کا شکر ہے کہ سوڈان میں اجتہاد پورے معاشرے کی تحریک بن چکا ہے۔ سوڈان کا ہر مسلم شہری اجتہاد میں اپنا حصہ لے رہا ہے اور اپنی علمی استعداد کے مطابق ہمارے ساتھ تعاون کر رہا ہے اور دین اسلام کے عملی نفاذ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کتابوں میں درج قیاس' اجماع' بلکہ کتابوں کی زیادہ تر باتیں ہی بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اجماع نام ہے امت کی رائے کا یعنی جس بات پر امت متفق ہو جائے' اس امت کے عالم اور جاہل سب کے سب۔ یہ الگ بات ہے کہ باہمی مشورے میں علما زیر بحث مسئلے پر جس قدر روشنی ڈال سکتے ہیں جاہل اس قدر نہیں۔ تاہم علما عوام سے گھلتے ملتے ہیں اور ان کے تقاضوں اور ضرورتوں کا ضرور خیال کرتے ہیں۔

ہم قرآن شریف کا مطالعہ کس طرح کریں؟ اس کی تفسیر کیسے کریں؟ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی سنت کا مطالعہ کس طرح کریں؟ یاد رہے کہ لفظ "سنت" سے ہماری مراد صرف "حدیث رسولؐ" نہیں ہوتی بلکہ سنت سے ہماری مراد عہد نبویؐ کے تمام نمونے ہیں۔ قرآن کی راہنمائی میں نبی اکرمؐ نے اپنے صحابہ کے ساتھ مل کر یہ عملی نمونے پیش کیے۔ حضورؐ صحابہؓ کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ان کی تصحیح کرتے تھے ان کی رائے اگر غلط ہوتی تو اس کو درست فرما دیتے جب کہ حضورؐ اور صحابہؓ کی رہنمائی و درستی' قرآن کرتا تھا۔

سوڈان میں نفاذ اسلام کے بعد لفظوں اور اصطلاحات کا مفہوم تبدیل ہو چکا ہے۔ فقہ "متخصصین" کا معاملہ نہیں رہی کہ وہی اس پر آخری سند ہوں۔ اب "فقہ" سب عوام کے لیے ہے۔ اگر ایک ماہر علوم کائنات' سائنس دان گہرائی سے کام لیتا ہے اور اپنے اس علم کو دین کی خدمت کے لیے استعمال کرتا ہے تو ہماری نظر میں وہ "فقیہ" ہے۔ ہمارے یہاں دین اور زندگی سب ایک ہیں' ان میں یکسانیت ہے اور وحدت ہے۔ ہمارے یہاں دین و مذہب کے لیے الگ وزارت نہیں۔ یہاں عبادات و معاملات میں فرق نہیں ہے' ساری زندگی ہی معاملہ ہے اور ساری زندگی ہی عبادت ہے۔ ہم عبادت و معاملہ میں تفریق کے قائل نہیں ہیں۔ اجتہاد سب کے لیے ہے۔ اگرچہ ان کے اجتہاد کے درجے و مرتبے میں تفاوت ہو گا مگر وہ سب باہم مشورے کے لیے اپنی اجتہادی قوتوں کو یکجا کریں گے۔ انھیں ایک نقطہ پر مرکوز کریں گے خواہ اجماع جامع ہو یا محلی و مقامی۔ ہم کتب اصول میں کئی باتیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ کتابیں بانجھ ہو چکی تھیں اب از سرنو عام لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ یہ اب تعلیم یافتہ طبقے کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

س : اس صدی کے آغاز سے لے کر نوے کی دہائی تک تحریک اسلامی کو مختلف دھاروں سے گزرنا پڑا ہے؟ تاہم

اگلی صدی تک پہنچنے کے لیے ابھی کرنے کا بہت کچھ کام باقی ہے۔ اسلامی تحریکوں کو درپیش مستقبل کے چیلنج کیا ہیں؟ اور ان کے راستے میں کیا رکاوٹیں ہیں؟

ج : اسلامی تحریکیں دراصل ایک طویل جمود و تعطل کے بعد معرض وجود اور حرکت میں آئی ہیں' مگر المیہ یہ ہوا کہ ان میں سے کچھ تحریکوں نے چند قدم چلنے کے بعد ہی اپنی معمولی یافت پر تکیہ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ ابھی تک ماضی کے بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھائے ہوئے کراہ رہی ہیں' وہ مڑ مڑ کر اپنی ماضی کی کارکردگی کی طرف دیکھتی ہیں مگر ان کی نظریں اپنے مستقبل سے چوک جاتی ہیں۔ وہ مستقبل سے لاپرواہ ہیں اور اس کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہیں ـــ مسلمان کی نظر آخرت پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی پوری زندگی کی منصوبہ بندی آخرت کے لیے کرتا ہے۔ وہ نقد نفع اور کمائی سے قطع نظر اپنی پوری زندگی جدوجہد میں گزار دیتا ہے بلکہ وہ نفع ملنے کی توقع آخرت میں رکھتا ہے۔ اس کی نمایاں مثال شہید ہے۔ اسلامی تحریکیں اپنے مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی نہیں کر پائیں۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ کچھ لوگ اسلامی تحریکوں میں رہیں تو اپنی ذات تک' اپنی دنیا تک محدود رہیں' مستقبل سے بے گانہ رہیں اور اگر اسلامی تحریکوں سے نکل کر کسی اور پارٹی میں شامل ہوں تو منصوبہ بندی کریں اور اپنی حکمت عملی وضع کریں۔

سوڈان کی اسلامی تحریک نے اسّی کے عشرے سے اپنی ہر سال کی مکمل منصوبہ بندی کرنی شروع کی' اخراجات کے لحاظ سے' حصول مقاصد اور ذمے داریوں کی ادائیگی کے لحاظ سے۔ سالانہ منصوبہ بندی کے بعد اس نے اعلیٰ اہداف کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس نے رحمت الٰہی پر انحصار کیا۔ وہ اہداف جو سوڈان جیسے ملک میں ہمیں بہت دور معلوم ہوتے تھے' بفضل الٰہی نزدیک آنے لگے۔ یہ تھا ہماری تحریک کا اسلوب و طریق کار۔ یوں ہماری مستقلاً منصوبہ بندی ہونے لگی۔

آپ نے آیندہ صدی کی بات ہے۔ اگر ہم نے ہر روز' ہر ماہ اور ہر سال کے لیے منصوبہ بندی کر رکھی ہے تو پھر ہمیں اکیسویں صدی میں داخل ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اسلام تو ہمیں منصوبہ بندی کا درس دیتا ہے' دیکھیے نماز فجر ہمارے لیے منصوبہ ہے۔ نماز عشا ہمارے لیے محاسبہ ہے۔ ایک نماز جمعہ سے دوسری نماز جمعہ تک ایک منصوبہ بندی ہے۔ ایک ماہ رمضان سے دوسرے ماہ رمضان تک بھی ایک منصوبہ ہے۔ گویا انسان کے لیے اس کی عبادات' اس کے سب معاملات اس کے لیے باقاعدہ منصوبے ہیں۔ اب الحمدللہ ہماری تحریک کا منصوبہ پوری زندگی پر محیط ہے۔

ہمارے اردگرد جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے ہم اس سے آگاہ ہیں۔ آج پوری دنیا ایک صحن خانہ بن چکی ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں چاہتے کہ اہل مغرب ہم پر یہ الزام لگائیں کہ ہم اسلام کو بزور شمشیر پھیلانا چاہتے ہیں یا ہم پر یہ تہمت لگائیں کہ ہم دہشت گردی اور بنیاد پرستی کے ذریعے اسلام کو توسیع دینا چاہتے ہیں۔

ہمارا ارادہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس علاقے میں اپنے اس دور میں' قومی زندگی کے تمام گوشوں میں اور آیندہ برسوں کے تمام مراحل کے دوران اپنی سرگرمیوں کی باقاعدہ منصوبہ بندی کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی بیداری پورے عالم اسلام میں پھیلنے والی ہے' اس لیے کل صلاحیتوں اور استعداد عمل کو مخصوص اہداف کے حصول کے لیے باقاعدہ منظم طور پر' پر از حکمت اسلوب میں بروئے کار لانے کی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔

اب اسلامی قیادت کو اپنے علم' اپنی مستعدی' اپنی سرگرمی' اپنی بیداری اور اپنی بیدار مغزی میں سب سے نمایاں ہونا چاہیے' خواہ یہ مسلم تحریکیں ہو یا مسلم معاشروں کے ذرائع اطلاعات و معلومات ہوں۔ اسلامی قیادتیں اور مسلم ذرائع ابلاغ جو کچھ امت اسلامیہ کے لیے پیش کر رہے ہیں وہ بہت کم ہے۔ انھیں جس حد تک امت مسلمہ اور انسانیت کو درپیش خطرات سے باخبر رکھنا چاہیے' وہ نہیں کر رہے۔

میرے خیال میں یہ سب سے بڑا چیلنج ہے اس لیے کہ دنیا اب قومی اور وطنی تعصبات سے کنارہ کش ہو چکی ہے۔ ان تعصبات نے عوام کو ہم سے دور کر دیا تھا اور عوام کے کان ہماری آواز سننے سے محروم تھے۔ مغرب میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی کش مکش ختم ہو چکی ہے۔ مغرب و مشرق نے اس سے نجات پالی ہے۔ اشتراکیت تو تقریباً مٹ چکی ہے چنانچہ اب دنیا کے مختلف ممالک میں قائم سیاسی پارٹیاں کسی مخصوص روایتی منشور کے بغیر کام کر رہی ہیں۔ مغرب میں لامذہب ' مذہب بن چکا ہے گویا مغرب اب مذہب سے فارغ ہو چکا ہے۔ اب دنیاوی خواہشات تو عقائد اور باقاعدہ مذاہب کو تشکیل نہیں کر سکتیں۔

ہم پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے لوگ جو مغرب کے محب بلکہ پرستار ہیں' ہم بھی مغرب سے متاثر ہو کر تعصبات کا شکار ہو گئے۔ ہمارے یہاں بھی ملکی' علاقائی اور صوبائی عصبیتوں نے سر اٹھایا۔ مغرب کی اس پیروی سے ہمیں سخت نقصان پہنچا۔ ہم خود ہی بھٹکنے لگے۔ جب لوگ بھٹک رہے ہوں' گم گشتہ راہ ہوں تو کسی لیڈر کے لیے ان کی راہنمائی آسان ہو جاتی ہے۔ وہ انھیں آسانی کے ساتھ صراط مستقیم پر چلا سکتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ ہم درپیش چیلنجوں کو جان سکیں۔ اب تو مشرق و مغرب کی مقابلہ آرائیوں کے بعد اسلام خود ایک مقصود بن چکا ہے اس لیے کہ اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے نہ ہٹائے تو زمین میں فساد ہونے لگے۔

ایک مسلمان کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مبشر بنے' وہ مسلمانوں کو بشارت دے کہ ان کا میدان عمل بہت وسیع و عریض ہے۔ اب تو کرہ ارض ایک نشیبی وادی کی طرح بن چکا ہے جس میں نشیب کی طرف پانی تیزی سے بہہ جاتا ہے۔ اتصال اور رابطے کے لحاظ سے کرہ ارض کی یہ حالت ہے تو مسلمانوں پر کچھ ہوائیں بھی آئیں گی اور ممکن ہے کہ پانی بھی ان تک آ پہنچے۔

س: نوے کی دہائی کے خاتمے کے ساتھ ہی بہت سی اسلامی تحریکیں' مختلف طریقوں سے مسند اقتدار تک پہنچی ہیں۔ جمہوریت کے راستے سے' جیسے ترکی میں رفاہ پارٹی' کئی انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آئیں جیسے سوڈان میں ہوا۔ بعض پارٹیوں نے بیلٹ بکس کے ذریعے اقتدار پانے کی کوشش کی مگر وہ اس منزل تک نہ پہنچ پائیں۔ کیا اقتدار پانے کے لیے کچھ مثالی اعلیٰ طریقے ہیں؟ یا یہ ہر ملک' علاقے یا براعظم کی کچھ مقامی خصوصیت ہوا کرتی ہے؟ کیا اسلام کی سیاسی تحریکوں کے لیے روا ہے کہ اگر وہ بیلٹ بکس کے ذریعے برسراقتدار نہ آسکتی ہوں تو وہ اس مقصد کے لیے اسلحہ استعمال کریں؟

ج: تہذیبی تبدیلیاں بالعموم اسی وقت ظہور پذیر ہوتی ہیں جب انسان اپنی جملہ صلاحیتوں اور طاقتوں کو بروئے کار لا چکا ہوتا ہے۔ ایسا محض اس کی جدلی صلاحیتوں کے اظہار سے نہیں ہوتا بلکہ ضروری ہے کہ اس کی جملہ فکری' جدلی اور جہادی صلاحیتیں یکجا ہوں تاکہ تہذیبی تغیرات رونما ہوں۔ یہی پوری دنیا کی تاریخ ہے۔ جمہوریت کی تاریخ بھی اس سے الگ نہیں ہے۔ جمہوریت بھی کسی ملک میں نرمی و آسانی اور مرحلہ وار نہیں آئی۔ سب تبدیلیاں انقلاب سے آئی ہیں حتیٰ کہ عادلانہ اقتصادی تبدیلیاں بھی بذریعہ انقلاب آئی ہیں۔ یہی حال دینی انقلابوں کا ہے۔ قرآن اس بارے میں بالکل واضح ہے۔ اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ لوگوں کے سامنے احسن طریقہ سے دینی تعلیمات پیش کریں۔ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل ۱۶:۱۲۵)' "اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو"۔ قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ (بنی اسرائیل ۱۷:۸۴)' "اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے"۔ "أَنُلْزِمُكُمُوهَا؟" (ھود ۱۱:۲۸) "پھر کیا ہم اس کو (زبردستی) تمہارے گلے مڑھ دیں؟" نہیں! نہ ہم اسے تمہارے گلے مڑھیں اور نہ تم اسے ہمارے گلے مڑھو۔ قرآن بتاتا ہے کہ جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ حق پرستوں کے مفاد میں حرکت کرنے والی ہے تو وہ بزور قوت ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ دھمکی دیتے ہیں: لنخرجنک من دیارنا ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے۔ کبھی قتل کی دھمکی دیتے ہوئے کہا جاتا ہے: لَأَقْتُلَنَّكَ میں تمہیں مار ڈالوں گا۔

اجتہادی طاقتوں کے ساتھ جہادی قوتوں کی بھی ضرورت ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور مانا ہوا اصول ہے۔ مسلمانوں نے نظام اسلام کے نفاذ کے لیے جمہوریت کا راستہ اپنایا' طاغوتی قوتوں کو مسلمانوں کی جمہوریت بھی پسند نہ آئی۔ اس جمہوریت سے یورپی قوتوں کو اپنے مفادات خطرے میں نظر آرہے تھے۔ جمہوریت کے انھی نام لیواؤں نے مسلمانوں کی جمہوری جیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

محض قتال سے بھی کام نہیں چلے گا۔ ضروری ہے کہ آپ سب طاقتوں کو یکجا کریں۔ اجتہاد اور جہاد دونوں قوتوں کو اکٹھا کریں۔ افغانستان میں جہاد کی قوت استعمال ہوئی۔ دس لاکھ سے زائد مجاہدین شہید ہو

گئے۔ محض جہاد سے وہ اپنے مقصد عالی میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے جہاد سے باطل کے باطل ہونے کو واضح کر دیا، مگر وہ حق کو حق ثابت کرنے میں ناکام رہے۔ فطرت خلا نہیں رہنے دیتی۔ باطل نابود ہو رہا ہو اور آپ اس کی جگہ لینے کے لیے آمادہ نہ ہوں یا آپ کو معلوم ہی نہ ہو کہ حق کو کیسے نافذ و سربلند کرنا ہے؟ حق کی کس طرح حفاظت کرنی ہے، تو پھر اس نابود باطل کی جگہ پر کرنے کے لیے کوئی اور باطل آ جائے گا جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ --- اسلام کہتا ہے کہ جہاد سے ابتدا نہ کی جائے بلکہ دعوت و اجتہاد سے آغاز کار کیا جائے۔ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (النساء ۴:۷۷)، "جنگ سے اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو"۔ اپنے عمل و کردار کے اعلیٰ نمونے قائم کرو۔ ایک دن آئے گا جب تم صف بستہ ہو جاؤ گے اور دشمن کے لیے تمھارا مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ تم جلد ہی اس پر جھپٹنے والے ہو۔ جب دشمن اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ تم پر حملہ آور ہو تو اس وقت تمھارا تیار ہونا بھی ضروری ہے۔ اب قوت کا مقابلہ قوت سے کرنا ہو گا۔ بحث و مجادلہ کرنے والوں سے مجادلہ اور لڑائی کرنے والوں سے لڑائی لڑنی پڑے گی۔

ہر ملک کی اپنی ایک منفرد تاریخ اور اپنا ایک مخصوص مزاج ہوا کرتا ہے۔ اس کے مطابق تحریک اسلامی کے لیے اس ملک میں ابتلا و آزمایش کے درجے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ملک کا ڈھانچہ اس طرح کا ہوتا ہے کہ وہاں پہلے کبھی اسلامی نظام قائم نہیں ہوا تھا، وہاں اسلام کمزور ہوتا ہے۔ وہاں نظام اسلام کے قیام کے لیے بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہاں نفاذ اسلام کی کوششیں بتدریج اور دھیرے دھیرے کی جائیں۔ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۴)، "نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے"۔

عوام اور حکومت کے مابین تعلق و رابطہ اور باہمی تعامل ہر ملک میں مختلف النوع ہوا کرتا ہے۔ کسی ملک میں عوام حکمرانوں کے قریب ہوتے ہیں۔ کہیں حکمران خاموش رہ کر اپنے عوام کی خیر خواہی میں مصروف رہتے ہیں۔ کسی ملک میں یہ ہوتا ہے کہ عوام کسی وادی میں سرگرداں ہیں تو حکمران کسی وادی میں ہیں۔ کسی ملک کے حکمران اپنے مزاج اور افتاد طبع کے لحاظ سے، عوام میں سے سرکردہ لوگوں کو اپنا مقرب خاص بنا لیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ملک کی اسلامی تحریک کو اپنے ملک کے حالات، اس کے کلچر، اس کے ماضی اور حکمرانوں کے رویے کو سامنے رکھ کر پورے غور و خوض کے بعد اپنے لیے حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ کے قوانین، قرآن اور انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

س: انتہا پسندی اور اپنے مقصد سے سچی لگن کے مابین کس طرح توازن قائم کیا جا سکتا ہے؟

ج: ہم انتہا پسندی کی اصطلاح استعمال نہیں کرتے۔ یہ ایک مغربی اصطلاح ہے۔ اہل مغرب اپنے آپ کو دنیا کا مرکز و محور سمجھتے ہیں مگر فی الحقیقت دنیا کا مرکز وہ نہیں' ہم ہیں' اس لیے کہ ہم دنیا کے وسط میں ہیں۔ ہم امت وسط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جغرافیائی اور مذہبی لحاظ سے امت وسط بنایا ہے تاکہ ہم گواہ بن سکیں' اپنے سے مشرق' مغرب' شمال اور جنوب والوں پر۔ یہ تو ہوا جغرافیائی لحاظ سے۔ ہم امت معتدل ہیں' اقتصادی و مالی لحاظ سے اپنے سے کم حیثیت والوں کے لیے۔ ہم فتنہ مال و جمال اور فتنہ حکومت و اقتدار بلکہ سب فتنوں سے بچنے میں لوگوں کے لیے راہ اعتدال پر قائم رہنے میں نمونہ ہیں۔ اہل مغرب اپنے آپ کو مرکز عالم گردانتے ہیں اور اپنے سے دوری اختیار کرنے والوں کو "انتہا پسند" کا لقب دیتے ہیں۔ آپ جتنے زیادہ دین دار ہوں گے اہل مغرب کی نظر میں آپ اتنے ہی بڑے انتہا پسند ہوں گے۔ ہم انتہا پسند کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ "حدود فراموش" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ حد مطلوب سے بڑھنے کی کوشش کریں۔

جیسے ایک نوجوان عالم شباب میں کچھ زیادہ ہی طرار ہوتا ہے' جلد بازی کا مظاہرہ کرتا ہے' اپنے والدین کی سرپرستی سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اپنے ماں باپ کے فریم ورک سے نکلنا چاہتا ہے۔ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے حالانکہ بسااوقات اس کی یہ پسند غیر معقول ہوتی ہے۔ یہی حال بعض اوقات تحریک اسلامی کا ہوا کرتا ہے۔ وہ جذباتی رویہ اختیار کرتی ہے۔ ہر جدید پر فریفتہ ہوتی ہے۔ تحریک اسلامی جب حالات سے متصادم ہوتی ہے تو اس کا ردعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ وہ حد مطلوب سے تجاوز کر جاتی ہے۔ وہ درگزر کو فراموش کر دیتی ہے۔ حالانکہ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوریٰ ۴۲:۳۷) "وہ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں"۔ تحریک کے افراد توکل نہیں کرتے حالانکہ حکم ہے لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (الشوریٰ ۴۲:۳۶) "وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں"۔

بعض اوقات ہمارا ردعمل ایک فطری امر ہوا کرتا ہے۔ اگر فریق مخالف دست درازی کرتا ہے' بدزبانی کرتا ہے' اپنی قوت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے لیے جیلوں کے دروازے کھول دیتا ہے تاکہ مجھے دبائے اور چپ کرائے تو میں ان حالات میں ضرور اس کا مقابلہ کروں گا۔ میرا یہ ردعمل جائز اور فطری ہو گا۔

آپ مصروف جدوجہد ہوں اور اہل مغرب آپ کو پسند کرتے ہوں تو وہ آپ کو "جنگجو' حریت پسند" کہیں گے اور اگر انھیں آپ کے مقصد سے اختلاف ہے اور وہ آپ کو ناپسند کرتے ہیں تو پھر وہ آپ کو

ہم منتقلی کے مرحلے میں ہیں۔ پورا عالم اسلام، مرحلہ انتقال سے گزر رہا ہے۔ اسلام کی تعمیر نو کی خاطر، بیداری اور تجدید عمل کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں دین کے اقتدار کا انتظار کرنا ہے۔ اعتدال سے کام لینا ہے۔ یہاں اعتدال سے میری مراد سکوت و بے عملی ہرگز نہیں ہے۔

س: مغرب کے ساتھ مکالمے کے بارے میں اسلامی حلقوں میں دو متضاد رائیں پائی جاتی ہیں۔ دونوں کے اپنے دلائل ہیں۔ کچھ لوگ مغرب سے مکالمے کے حق میں ہیں کچھ دوسرے اس کے خلاف ہیں، وہ اسے تہذیبی تصادم قرار دیتے ہیں۔ اکثریت اس بارے میں متذبذب ہے۔ آپ کا موقف کیا ہے؟

ج: ہم تو اہل مغرب سے مکالمے کے حق میں ہیں۔ وہ ابتدا نہیں کرتے تو ہم خود پہل کریں گے۔ مکالمے کی ابتدا کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ انھیں دعوت دیں، انھیں خبردار کریں، انھیں خوشخبری دیں۔ اس لیے کہ ہم ان کے مذہب، ان کی زبان اور ان کی تاریخ سے واقف ہیں جب کہ وہ ہمارے دین، ہماری زبان اور تاریخ سے کماحقہ، آشنا نہیں ہیں۔ ہم امتیازی اوصاف کے حامل ہیں۔ ہم مکالمے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ ان کے پاس یہ سب کچھ نہیں۔ لہٰذا ہم ان سے مکالمہ و مذاکرہ ضرور کریں گے۔ اس میں پہل کریں گے۔

تصادم میں ضروری ہوتا ہے کہ آپ پہل کاری کریں۔ ہمارے لیے روا نہیں کہ ہم کسی پر زیادتی کریں۔ ہاں جب کوئی ہم پر زیادتی کرے گا تو پھر ہم دیکھیں گے کہ آیا اس کی زیادتی سے ہمیں کوئی بڑا خطرہ ہے یا نہیں۔ اگر بڑا خطرہ نہیں ہے تو پھر ہم درگزر کریں گے۔ ہم نصرانیت کے بقول ــــــ اس کے سامنے اپنا دوسرا گال بھی کر دیں گے۔ اگرچہ یہ عیسائیت کا نظری عقیدہ ہے۔ اس پر ان کا عمل نہیں ہے۔

آپ کو کوئی تھپڑ مارے تو آپ کو اسے معاف کرنے یا اپنا دفاع کرنے کا اختیار ہے۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے مگر ہم تو اسلامی وجود کے محافظ ہیں۔ ہم پر کوئی حملہ کرتا ہے تو ہم سوچ سمجھ کر حملہ آور کے خلاف اقدام کا فیصلہ کریں گے۔ اور یہ طے کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟ مکالمہ یا جہاد، مذاکرہ یا مقابلہ؟ آپ نے اپنے سوال میں جسے تضاد قرار دیا ہے، میں اسے تضاد نہیں سمجھتا، نہ میں اسے تذبذب سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ہم میں سے ہر شخص اہل مغرب سے مکالمے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی صاحب ان سے ان کی عقلی سطح کے مطابق، ان کی زبان میں ان سے مکالمہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں، اور ایسا کرنا مناسب سمجھتے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب یا کوئی گروہ اپنے اندر میدان جہاد و قتال میں اہل مغرب سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت پاتا ہے اور اسے زیادہ کارگر سمجھتا ہے۔ یہ صلاحیتوں، موقع محل اور وقت کی بات ہوا کرتی ہے۔

ہم سب کو یک جان ہو کر متفقہ پروگرام کے مطابق قدم اٹھانا ہوگا، یا مکالمہ یا جہاد، کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور اس سے پہلے ہمیں اپنی تکمیل کر لینی چاہیے۔ ہمیں میدان قتال میں بھی سوچ سمجھ اور متفقہ

سے کام لینا ہو گا۔ "ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم" (التوبہ ۹:۱۲۲)، "اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے"۔

حتیٰ کہ ہم جس کے خلاف لڑائی کر رہے ہوتے ہیں اسے قتل کرنا بھی ہمارا اصل مقصد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ہمیں اس شخص سے ذاتی عداوت نہیں ہوتی۔ ہم تو اس نظام سے برسرپیکار ہوتے ہیں جس کے تحفظ کے لیے وہ شخص میدان جنگ میں اترتا ہے۔ ہم اسلحہ اٹھاتے ہیں تاکہ اس شخص کے قبول اسلام کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کر دیں۔ لوگوں کے سینوں کو، شہروں کو اسلحے سے فتح کر لینا کوئی کمال نہیں، بہترین فتح تو انسانوں کے سینوں کو ہدایت سے فتح کرنا ہے۔ علاقوں کو نور اسلام سے فتح کرنا ہے۔

مذاکرات مقاصد جہاد میں شامل ہیں۔ جہاد کے لیے تیاری ضروری ہے۔ اگر دشمن کو یقین ہو کہ آپ اس کے خلاف میدان جنگ میں جہاد نہیں کریں گے تو وہ کبھی آپ کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے آمادہ نہ ہو گا۔

پاکستانیات

یوم آزادی کی پکار

رئیسہ عزیز

شیخ سعدی کی ایک حکایت ہے کہ ایک مسافر اندھیری رات میں کسی رہگذر سے گزرا۔ اس نے دیکھا کہ سرراہ ایک نابینا ہے اور اس کے ہاتھ میں روشن چراغ ہے۔ مسافر کو بڑی حیرت ہوئی۔ خاموش نہ رہ سکا اور نابینا سے دریافت کیا کہ تم خود تو بینائی سے محروم ہو، تمھارے لیے رات کی تاریکی اور دن کا اجالا برابر ہے، پھر تمھارے ہاتھ میں یہ روشن چراغ کیوں ہے؟

نابینا نے جواب دیا: "یہ چراغ میں نے اپنے لیے نہیں بلکہ تمھارے لیے روشن کیا ہے"۔

اس حکایت سے نصیحت اور عبرت کے بہت سے پہلو نکلتے ہیں لیکن تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیجیے کہ یہ نابینا ہمارا ماضی ہے اور اس کے ہاتھ میں روشن چراغ ہماری رہنمائی کے لیے ہے۔

اس نابینا کی اب کوئی منزل نہیں ہے۔ وہ اپنے وقت کا حساب بے باق کر چکا ہے۔ اس کی مہلت عمل ختم ہو چکی ہے۔ اس کا اقتدار باقی نہیں رہا۔ اس کا اختیار سلب کر لیا گیا۔ اس کی فتوحات داستان پارینہ ہیں اور اس کی ناکامیاں سامان عبرت ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہمارا تعلق، ہمارا رشتہ، ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اسی رشتے اور اسی تعلق کی خاطر ہمارا ماضی سرراہ اس چراغ کو روشن کیے ہوئے ہے۔ اور زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ "دیکھ کر چلو۔ جن پتھروں سے ہم نے ٹھوکر کھائی، تم اس سے ٹھوکر مت کھانا۔ جن خار زاروں میں ہم الجھائے گئے، تم اس سے لہولہان مت ہونا۔ جن راہوں پر ہمارا قافلہ لٹ گیا، اس رہگذر سے تم مت گزرنا۔ جس گرداب میں ہماری کشتی ڈوبی ہے، تم اس سے بچ نکلنا۔ جن دوست نما دشمنوں سے ہم نے فریب کھائے، ان کی چالوں سے تم ہشیار رہنا۔ جو ہم نے کھو دیا، اسے تم پالینا۔ جو ہم نہ کر سکے۔ تم کر گزرنا"۔

جو قومیں اپنے ماضی سے سبق نہیں لیتیں، وہ مٹ جاتی ہیں۔

اَوَ لَمْ یَھْدِ لِلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَھْلِھَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ ۔ وَنَطْبَعُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ (الاعراف ۷:۱۰۰)

اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہل زمین کے بعد وارث ہوتے ہیں، اس امرواقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے قصوروں پر انھیں پکڑ سکتے ہیں؟ (مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں) اور ہم ان کے دلوں پر مہرلگادیتے ہیں، پھروہ کچھ نہیں سنتے۔

جو قومیں گذشتہ نسلوں کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتیں، اللہ کا عذاب ان سے قریب ہوتا جاتا ہے۔ جو عروج کے نشے میں زوال کے اسباب کو نظرانداز کر دیتی ہیں، وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ جو قومیں جدوجہد آزادی کی خونچکاں داستانوں کو اپنی کتاب زندگی سے مٹا دیتی ہیں، وہ غلامی کی زنجیروں سے نہیں بچتیں۔

یہ ایک زندگی سارے تجربات خود کرنے کے لیے بہت تھوڑی ہے۔ اسی لیے ہر قوم کا ماضی اس کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے جو اپنے عروج و زوال اور فتح و شکست کی داستان ہی نہیں بلکہ صدیوں کے تلخ و شیریں تجربات کے ماحصل کو بھی اپنی آیندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بنا دیتا ہے۔

ہم جن مراحل سے گزر رہے ہیں، وہ گزر چکا ہے، جو جدوجہد ہم کر رہے ہیں، وہ کرچکا ہے۔ غلامی سے آزادی تک کے جو فاصلے آج ہم ناپ رہے ہیں، وہ ان کی پیمایش کرچکا ہے۔ دوست اور دشمن کی شناخت میں جو غلطی ہم کر رہے ہیں، وہ کرچکا ہے۔

آج ہر رہگذر پر ہمارا ماضی ہمیں آواز دے رہا ہے، ہمیں خبردار کر رہا ہے۔ ہمیں ان راہوں کے نشیب و فراز سے آگاہ کر رہا ہے۔ ہم پر دوست اور دشمن کا فرق واضح کر رہا ہے۔ ہمیں آزادی کی قدر و قیمت اور غلامی کی سو سالہ بے آبروئی اور دار و رسن کی جاں گداز داستان سنا رہا ہے۔ ۴۹ سال قبل پاکستان کے قلب پر جو قیامت ٹوٹی تھی اور اس المیے کے پس پردہ جو طاقتیں کارفرما تھیں، ان کی نشاندہی کر رہا ہے۔ تمھیں تمھاری آپ بیتی سنا رہا ہے۔

کیا اس کی پکار نہ سنو گے؟ کیا اس کی نصیحتوں کو بے وقعت کر دو گے؟

کیا اپنی سماعت، اپنی بصارت اور اپنی بصیرت کو رائیگاں کر دو گے؟

ایک اسلامی ریاست کا نظریہ تمھارا تھا۔ یہ تخیل تمھارا تھا۔ یہ برحق مطالبہ تمھارا تھا۔ وہ جدوجہد تمھاری تھی۔ وہ جذبہ تمھارا تھا۔ وہ کامیابی تمھاری تھی۔ وہ فتح تمھاری تھی۔

تو یہ --- انتشار --- یہ بدامنی، یہ خون ریزی، یہ عداوتیں اور یہ نفرتیں--- یہ شکست و ریخت کس کی ہیں؟--- اور کیوں ہیں؟

تمھارے خون آلود ہاتھوں میں یہ خنجر کس کا ہے؟ تمھارے محبت بھرے سینوں میں یہ آتش انتقام کس کی ہے؟ تمھارے سادہ ذہنوں میں یہ تخریب کاری اور تشدد کا جنون کدھر سے آیا ہے؟ تمھاری رگوں میں نفرتوں اور عداوتوں کا یہ زہر کس نے سرایت کیا ہے؟ تمھارے گردوپیش کشت و خون کا یہ بازار کس نے

گرم کیا ہے؟ کہیں یہ سابق مشرقی پاکستان کی صدائے بازگشت تو نہیں؟

ذرا پیچھے پلٹ کر دیکھو--- اور پہچانو--- کہ وہ کون تھے جن کے سینوں پر قیام پاکستان انگارہ بن کر دہک اٹھا تھا؟

--- وہ کون تھے جنھوں نے پاکستان کے مجوزہ نقشے پر زہر آلود خنجر سے لکیریں کھینچیں تھیں؟

--- وہ کون تھے جن کی سازشوں نے پنجاب' بنگال اور کشمیر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے؟

--- وہ کون تھے جنھوں نے پورے ہندستان میں آتش انتقام کے شعلے بھڑکائے تھے؟

--- وہ کون تھے جنھوں نے لاکھوں مسلمانوں کو کلمہ گو ہونے کے جرم میں تہ تیغ کر دیا تھا؟

--- وہ کون تھے جنھوں نے مطالبہ پاکستان کی پاداش میں ہمارے نونہالوں کو برچھیوں میں پرو دیا تھا' ہماری بیٹیوں کو بے آبرو کیا تھا' ہمارے بیٹوں کی لاشوں کے انبار لگائے تھے؟

--- وہ کون تھے جنھوں نے پاکستان کے قلب میں خنجر اتار کر اسے دو لخت کر دیا تھا؟

تقسیم کے نازک مرحلے پر خانماں برباد مہاجروں کے لٹے پٹے قافلے آئے جنھیں قصد ہجرت کی مہلت بھی نہیں دی گئی' جنھیں سنگینوں کی زد پر پاکستان کی سرحدوں کی جانب دھکیلا گیا تھا' جن کے قافلے ہر منزل پر لٹے تھے' جنھوں نے قدم قدم پر اپنے جگر گوشوں کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑی تھیں' جنھیں اتنی مہلت بھی نہ دی گئی تھی کہ اپنی بیٹیوں کی برہنہ لاشوں پر چادریں ڈال سکتے' جنھیں یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ اپنے اعزہ کے زندہ یا مردہ ہونے کی تصدیق کر سکتے۔ اور یہ مہاجر بھی کسی ایک صوبے سے نہیں آئے تھے۔ ان میں غیر منقسم ہندستان کے ہر صوبے کا ستم رسیدہ شامل تھا۔

یہ کیسی سزا تھی؟ یہ کیسی عقوبت تھی؟ اس جرم کی پاداش میں کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود انھوں نے مسلم اکثریتی علاقے میں قیام پاکستان کی تائید کی تھی۔ انھوں نے دین کی سربلندی اور اسلام کی بقا کے لیے ایک علیحدہ سرزمین کا مطالبہ کیا تھا۔ انھوں نے اسلام دشمن عناصر کا پردہ چاک کر دیا تھا۔ انھوں نے دو قومی نظریے کی توثیق کر دی تھی۔

ان کا جرم بڑا سنگین تھا نا!

افتاں و خیزاں' برہنہ سر' برہنہ پا' چاک گریباں' یہ قافلے جب پاکستان کی سرحدوں تک پہنچے تھے تو کسی نے ان کے راستے نہیں روکے تھے بلکہ ان کی پذیرائی کے لیے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہ ملک اس وقت ملک خداداد تھا۔ کسی کی جاگیر نہیں تھی۔ کسی کا ورثہ نہیں تھا۔ اور کسی نے بھی اپنی معیشت تباہ ہونے کے اندیشے سے دل تنگ نہیں کیے تھے بلکہ بنگال' پنجاب' سندھ' بلوچستان اور سرحد نے اپنے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے تھے۔ اپنی آغوش محبت میں سمیٹ لیا تھا۔ اپنے بازوؤں کے حصار میں پناہ دی تھی۔ ان

کے زخموں پر مرہم رکھا تھا۔

--- اس وقت یہاں نہ ملیں تھیں، نہ فیکٹریاں تھیں۔

--- نہ سرمایہ تھا، نہ سرمایہ دار تھے۔

--- نہ عصبیت تھی، نہ کرسی کے دعویدار تھے۔

--- نہ دولت تھی، نہ دولت کے پرستار تھے۔

--- نہ اسلحہ تھا، نہ تخریب کار تھے۔ بس دنیا کے نقشے پر دو چھوٹے چھوٹے گھروندے تھے۔ اور اس کے مکینوں کے دل کشادہ اور وسیع صحن تھے۔ ان گھروندوں کے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ اس وقت یہاں نہ کوئی بنگالی تھا نہ بہاری، نہ پنجابی تھا نہ پٹھان، نہ سندھی تھا اور نہ بلوچی بلکہ سب مسلمان تھے اور سب پاکستانی تھے۔ صوبوں کی حد بندیاں انتظامی امور کے لیے تھیں۔ بھائی بھائی کے درمیان خط فاصل نہ تھے۔

بڑا سہانا وقت تھا کہ جو جہاں چاہتا اپنا نشیمن بنا لیتا۔ جس کو جہاں روزگار کے مواقع میسر آتے وہیں کا ہو رہتا۔ جس کو جہاں کا آب و دانہ راس آتا وہیں ڈیرے ڈال دیتا۔

اخوت و محبت، اتفاق اور اتحاد کی یہی فضا تھی کہ اللہ کی رحمتوں نے ہمیں نواز دیا۔ آسمان سے رزق برسا اور زمین سونا اگلنے لگی۔ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ (الاعراف ۷:۹۶) کے مصداق یہ نوزائیدہ تھی دامن ملک سیراب و شاداب ہونے لگا، پروان چڑھنے لگا۔ وہ طاغوتی عناصر جنھوں نے پاکستان کے وجود کو چار دن کی چاندنی سمجھ کر مجبوراً گوارا کر لیا تھا اور سرمائے کی تقسیم میں خیانت کے مرتکب ہوئے تھے، ترقی اور استقامت کی طرف بڑھتے ہوئے پاکستان کے قدم دیکھ کر پھر بے تاب ہو گئے، بے قرار ہو گئے۔

اور دشمنوں نے ۶ ستمبر ۶۵ کی رات اچانک اور ناگہاں اعلان جنگ کے بغیر، بین الاقوامی قوانین کو پامال کر کے لاہور کی سرحد پر شب خون مارا تھا۔ ان کے عزائم اور ان کی نیتیں ایک بار پھر بے نقاب ہو گئی تھیں۔

۶ ستمبر کو ہر سال ہم یوم دفاع مناتے ہیں۔ سرکاری تعطیل ہوتی ہے۔ فوجی پریڈ اور سلامیاں ہوتی ہیں۔ خون کو حرارت بخشنے اور ایمان کو تازہ ولولہ دینے والے قومی نغمے ہوتے ہیں۔ وطن کی حفاظت کرتے ہوئے جن دلیروں اور جاں بازوں نے جام شہادت نوش کیا ان کے لیے سلام عقیدت ہوتے ہیں۔ یہ سارے جذباتی کام بڑے اچھے ہیں۔ اس سے قوم کا وقار بلند اور اعتماد بحال ہوتا ہے۔

لیکن ہر یوم دفاع پر ستمبر ۶۵ کی جنگ اور دسمبر ۷۱ کی ذلت آمیز شکست کا موازنہ، اس کے اسباب و عوامل سے ہمیں اہل پاکستان اور اپنی نئی نسل کو پوری صداقت اور دیانت داری سے ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ ستمبر ۶۵ کی جنگ میں دشمن کے عزائم اور اس کے خواب اس لیے شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے کہ اس وقت ہماری

بنیادیں کھوکھلی کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اس وقت تک ہمارے درمیان نظریہ پاکستان کی دھجیاں بکھیرنے والے، دشمن دین و ایمان، ضمیر کے سوداگر اور آستینوں کے سانپ موجود نہ تھے۔ اس وقت تک شہادت اور ہلاکت کا فرق ہم میں باقی تھا۔ اس وقت تک پاکستان اپنے وسائل کی کمی کے باوجود جنگ اور جہاد کا فرق جانتا تھا۔ اس وقت تک بھائی بھائی کے دلوں میں شگاف نہیں پڑے تھے۔ اس وقت تک نقاب پوش قاتلوں نے ضمیر کی سرحد عبور نہیں کی تھی۔ اس وقت تک ہمارے ہاتھ اپنوں کے خون سے لہو رنگ نہیں ہوئے تھے۔ جن جذبوں نے سرزمین پاک کو دفاعی حصار عطا کیا تھا، وہ آلودہ نہیں تھے، بے لوث تھے۔

اسی لیے ہمارے عزم و حوصلے کی چٹان سے ٹکرا کر دشمن کے ناپاک عزائم پاش پاش ہو گئے تھے اور جشن فتح کے لیے لاہور کے جم خانہ میں جام و ساغر ٹکرانے کی شرط ہار گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ دوسرا زخم تھا جس نے ان کی آتش انتقام کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ انھیں بہرصورت اسلام کا پرچم سرنگوں کرنا تھا۔ پاکستان کو اپنے ناپاک قدموں سے روند ڈالنا تھا۔ نظریہ پاکستان کے امتیاز اور افتخار کو مٹا ڈالنا تھا۔

اس جنگ کی ناکامی اور رسوائی نے ان کے حوصلے پست نہیں کیے تھے۔ جن جذبوں نے انھیں شکست دی تھی، جس اتفاق اور اتحاد سے ٹکرا کر ان کی فوجی طاقت کا زعم پاش پاش ہو گیا تھا، انھیں اب ان جذبوں کو مٹانا تھا۔ اتفاق و اتحاد اور عزم و حوصلے کو نشانہ بنانا تھا۔ اسلامی تشخص اور وقار کو مجروح کرنا تھا۔ اب اس سرحد کو نہیں، اس سرحد کو عبور کرنا تھا جہاں کے لوگ زیادہ سادہ لوح، زیادہ نادان اور زیادہ معصوم بھی تھے اور اپنے مرکز سے دور بھی۔

اس بار وہ آتشیں اسلحہ لے کر میدان جنگ میں نہیں اترے تھے بلکہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر ہماری صفوں میں در آئے تھے۔ مقصد وہی تھا۔ عزائم وہی تھے۔ انداز بدل گئے تھے۔ اب انھیں عصبیت، عداوت اور نفرت کا زہر خود ہمارے سینوں میں اتارنا تھا۔ اب وہ حق تلفی، آزادی اور علیحدگی کے نعرے لے کر آئے تھے۔

الفاظ ان کے تھے، زبان ہماری تھی۔ عزائم ان کے تھے، تعاون ہمارا تھا۔ منصوبے ان کے تھے، کاوشیں ہماری تھیں۔ ہم نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آزادی کا جو نعرہ تم ہم کو دے رہے ہو، علیحدگی کا جو سبق تم ہم کو سکھا رہے ہو، خود تمھارے جال میں کتنے اسیر تڑپ رہے ہیں؟ پنجاب، آندھرا پردیش اور آسام جیسے تمھارے بے شمار صوبے کن آہنی شکنجوں میں گرفتار ہیں۔ ہمیں آزادی اور خود مختاری کے سبز باغ دکھانے والے خود کتنوں کے لیے پیر کی بیڑیاں اور گلے کا طوق بنے ہوئے ہیں۔

اتنی بڑی حقیقت ہمارے سامنے سینہ تانے کھڑی تھی کہ پاکستان بنا تو بنگلہ دیش کا فتنہ اٹھایا گیا تھا، ورنہ مغربی بنگال کو بھی تو بنگلہ دیش بنایا جا سکتا تھا۔ ایک ہی صوبے کے یہ دو حصے تھے۔ سرحدوں سے سرحدیں آج بھی ملی ہوئی ہیں۔ فاقہ کشی، افلاس اور غربت کی انتہا کے باوجود بھارت کی ممتا اس کے لیے بے قرار نہ ہوئی۔ وہاں

کوئی صدائے احتجاج نہیں۔ کسی حق تلفی کی داستان نہیں۔ کسی علیحدگی اور خود مختاری کے نعرے نہیں۔

خود ہم ہی دانائی اور بینائی سے محروم ہوں تو الزام کس کو دیں؟

جو خود اپنی غیرت و حمیت' آزادی اور خود مختاری کا تحفظ نہیں کرتے' جو خود اپنی آبرو سے کھیلتے ہیں' جو خود اپنے نشیمن کو نذر آتش کرتے ہیں' جو خود اپنے گلستانوں کی ویرانی کے درپے ہوتے ہیں' جو خود اپنی ماؤں اور بہنوں کے سروں سے چادریں چھینتے ہیں' جو خود اپنے بچوں کو ذبح کرتے ہیں' جو خود اپنی شاہ راہوں پر بارودی سرنگیں بچھاتے ہیں' ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارا سقوط ڈھاکہ کے وقت ہوا۔

کاش زمین شق ہو جاتی اور آسمان پھٹ پڑتا یا بوڑھی گنگا اور میگھنا اپنے کناروں سے ابل پڑتے اور ان کی طوفانی موجیں سب کچھ بہا لے جاتیں۔ سب کو غرق کر دیتیں۔ نہ آزادی اور خود مختاری دلانے والے باقی رہتے' نہ ان کے فریب میں آکر ناموس اسلام کو تار تار کرنے والے باقی رہتے۔ نہ بے گناہوں کے خون سے زمین سرخ ہوتی نہ عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سے کلیجے شق ہوتے اور نہ جوانوں کے سینوں میں سنگین اتار کر رقص بسمل پر تالیاں بجانے والے سلامت رہتے۔ بس طوفان کی بہت سی خبروں جیسی ایک خبر ہوتی۔ مسلمان رسوا تو نہ ہوتے۔

جو خونی ڈراما وہاں کھیلا گیا' اس سے آدھی قوم کو یہاں بے خبر رکھا گیا۔ اس کی فلمیں پاکستان کے سوا ہر ملک میں دیکھی گئیں۔ بس ہماری ہی آنکھوں پر پردے ڈال دیے گئے تھے۔

وہ خونچکاں داستان' وہ لرزہ خیز واقعات' ظلم و بربریت کے وہ روح فرسا مناظر' ہم ظاہر کریں یا حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی طرح ستر پردوں میں چھپا کر رکھیں.....!

کل کا تاریخ نویس ہمارے اعمال و کردار کا بے لاگ تجزیہ ضرور کرے گا جو ہم کہہ نہ سکے' وہ کہہ گزرے گا۔ جو ہم لکھ نہ سکے' وہ ضرور لکھے گا اور جن حقیقتوں سے ہم نظریں چراتے ہیں' بر سر عام ضرور لائے گا۔

قوموں کے عروج و زوال کی داستان صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ ہم نے یہ فاصلے بڑی برق رفتاری سے طے کیے کہ آغاز و انجام سربہ گریباں ہیں۔ پچاس سال کے اس مختصر دور میں نہ جمہوریت نے ہمیں پناہ دی نہ مارشل لا ہمارے زخموں کا مداوا کر سکا۔ نہ قانون تحفظ دے سکا' نہ عدالتیں انصاف کر سکیں۔ اقتدار اور اختیار کی اس رسہ کشی میں غیر ملکی اور اسلام دشمن ریشہ دوانیوں کا شکنجہ ہم پر مضبوط ہوتا گیا۔ ملک کے اندر ایسے عناصر جو شروع سے پاکستان کے مخالف تھے' ان کے فتنے اپنے نکتہ عروج پر پہنچ گئے ہیں۔

اب نہ کوئی رہبر ہے' نہ سالار قافلہ۔ نہ نشان راہ ہے' نہ منزل کا تعین بلکہ نفسا نفسی کے اس میدان حشر میں تعصب اور تشدد کا سورج سوا نیزے پر آگیا ہے۔ آج ہم بھی لٹ رہے ہیں۔ تم بھی لٹ رہے ہو۔

ہم بھی مقتول ہیں، تم بھی مقتول ہو۔ پھر یہ لٹیرے اور یہ قاتل کون ہیں؟ انھیں پہچانو گے نہیں---؟

ہماری آبادیوں کے گلی کوچے شام غریباں کا عنوان بن گئے ہیں۔ ملک کا قریہ قریہ اسلحے کا مینابازار بن گیا ہے۔ اس انتشار کے ذمہ دار، اس مینابازار کے خریدار، یہ نقاب پوش تخریب کار کون ہیں؟ انھیں پہچانو گے نہیں---؟

جن جذبوں کو جذبہ جہاد بننا تھا، جن بازوؤں کو اسلام کا علم بردار بننا تھا، جن حوصلوں کو قوم کا معمار بننا تھا، جن طاقتوں کو سیسہ پلائی دیوار بننا تھا--- ان جذبوں اور ان بازوؤں کو، ان حوصلوں اور ان طاقتوں کو خود تمھاری ہلاکت کے لیے اپنا آلہ کار کس نے بنالیا ہے؟ انھیں پہچانو گے نہیں---؟

جنگ تو دشمن سے لڑی جاتی ہے۔ خون تو اسلام کو غالب کرنے کے لیے بہایا جاتا ہے۔ جان و مال کی قربانی تو طاغوتی طاقتوں کو مغلوب کرنے کے لیے دی جاتی ہے اور اسلحے تو تحفظ اور بقا کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اور تم تو خود اپنے آپ سے لڑ رہے ہو۔ تم تو اسلام کے ناموس سے کھیل رہے ہو۔ تم تو اپنے سارے ہتھیار خودکشی کے لیے استعمال کر رہے ہو۔ تم نے اپنی آزادی، اپنی بقا، اپنی سلامتی، اپنا دین اور اپنا ایمان سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔

اسلام کی ساری اصطلاحوں کو بے معنی کر دینے والے، خون مسلم کو ارزاں اور سرزمین پاک پر آتش نمرود کے شعلے بھڑکانے والے، بیٹوں کو قتل اور بیٹیوں کو اغوا کرنے والے، یہ فرعون کے نمایندے کون ہیں؟ انھیں پہچانو گے نہیں---؟

اپنے نشیمن میں دشمن کی لگائی ہوئی آگ کو تم ہوا دے رہے ہو اور جن ہاتھوں نے مشرقی پاکستان کو مٹایا تھا، وہ تمھارے رگ گلو تک پہنچ چکے ہیں۔ جو چنگاری تم نے اپنے دامن میں چھپائی تھی، وہ شعلہ بن کر تمھارے گریبان تک پہنچ چکی ہے۔ زبان، رنگ و نسل اور قبیلوں کی اس تفریق نے تمھارا دامن تار تار کر دیا ہے۔ تمھاری طاقتوں کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ گھر کے اندر سرحدوں کے حصار میں رہ کر تم اپنی حفاظت نہیں کر سکے۔ دشمن کے ہاتھوں شطرنج کے بے بس مہرے بن گئے۔ پھر اس سرحد کے باہر دور دور تک تاحد نگاہ، یہود و نصاریٰ نے تمھارے لیے سازشوں کا جو جال بچھایا ہے اس سے کیسے بچو گے؟

اسلام تو امن و اخوت کا پیغامبر ہے۔ زبان، رنگ و نسل، قبیلوں اور فرقوں کو مٹا کر ایک قوم، ایک ملت، ایک جماعت، ایک وحدت میں ڈھالنے والا ہے۔ اور تمھارے دشمن، تمھیں گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر کے یکے بعد دیگرے شکار کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کو رسوا اور دو قومی نظریے کو ساقط کرنا چاہتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس نسخہ کیمیا کو اپنے جزدانوں سے نکالتے جو ہمارے مسائل کا حل ہے جس کے ہم امین ہیں۔ جو ہمارا دین اور ہمارا ایمان ہے جو ہماری وحدت اور سالمیت کی ضمانت ہے اور جو نظریہ

پاکستان کا محافظ ہے۔ اگر اس کو ہم اپنا رہبر بناتے تو آج یہ روز بد ہمیں دیکھنا نہ پڑتا۔ قرآن حکیم سے ہمیں وہ بصیرت ملتی کہ اقتدار اور اختیار کی ہوس اور پیچ ور پیچ سیاست کو ہم پہچان لیتے۔ اور دام ہم رنگ زمین میں الجھ کر نہ رہ جاتے۔

اس کے برعکس ہم نے اپنے سارے وسائل اور وہ تمام ذرائع جو ذہنوں اور دلوں کو متاثر کر سکتے تھے، اسلام اور اللہ کی شریعت کو بدنام اور مسخ کرنے، اس کو تضحیک کا نشانہ بنانے، لوگوں کو اس سے بدگماں اور متنفر کرنے کے لیے استعمال کیے۔ ہمارے نام نہاد لیڈروں اور رہنماؤں نے اپنے اقتدار اور اپنی کرسی، اپنی حکومت اور اپنی برتری کے داؤ پیچ میں پاکستان کے تحفظ اور نئی نسل کے رجحان کو بالکل نظرانداز کر دیا۔

جن چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کو ہم نے فلموں اور ڈراموں میں ہیرو بنا کر پیش کیا، وہ اب مجسم ہو کر پردۂ سیمیں سے باہر نکل آئے ہیں اور ہماری چھاتیوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔

اللہ کے قانون کو ظلم اور بربریت ثابت کرنے والوں نے ہاتھ کاٹنے کی سزا کو انسانیت سوز قرار دے دیا۔ اب ان ظالموں کے ہاتھ کون پکڑے گا جو چوریاں نہیں، دن دہاڑے ڈاکے ڈالتے ہیں۔ اور بے گناہ شہریوں کو صرف ان کے سرمائے اور پونجی سے ہی محروم نہیں کرتے بلکہ سینہ گولیوں سے چھلنی اور سرتن سے جدا کر دینے کی مہارت رکھتے ہیں۔ پتا نہیں یہ انسانیت کی کون سی منزل ہے!

حدود شریعت کیا ہیں؟ کوئی نہیں جانتا
اس کے تقاضے کیا ہیں؟ کوئی نہیں جانتا
اس کی شرائط کیا ہیں؟ کوئی نہیں جانتا

لیکن بدچلنی، حق تلفی، ناانصافی اور ظلم و تشدد کے جتنے فتنوں کو ہمارے بے لگام معاشرے نے جنم دیا ہے، ان سب پر ہم نے حدود آرڈیننس کا لیبل چسپاں کر کے مباحثوں اور مذاکروں کے ذریعے، اخباری بیانات اور قسط وار ڈراموں کے ذریعے عام لوگوں کو اس سے برگشتہ کیا، متنفر کیا اور بندوں کو اپنے خدا سے بدگمان کیا۔ اور کبھی ان والدین کے دلوں میں جھانک کر نہ دیکھا جن کی بیٹیاں دن دہاڑے سڑکوں، شاہ راہوں اور درس گاہوں سے اٹھائی جاتی ہیں۔ پتا نہیں اخلاق اور کردار کی یہ بلندی کس منصب پر ہے۔

ایک بنگلہ دیش بن چکا ہے اور ایسے بہت سے دیش بنانے کے مدعی ہمارے گردوپیش موجود ہیں۔ مگر ہم نے اس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ یہ سارے مطالبے پاکستان کے دم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دیش بنتے اور ٹوٹتے رہیں گے لیکن پاکستان کے نظریے اور سالمیت کی حفاظت ہم نے اگر نہ کی تو پھر پاکستان کبھی نہ بن سکے گا۔

آج ہماری کشتی حیات پر بار عصیاں اس کی بساط سے بڑھ کر ہے۔

--- اس کی تہہ میں شگاف پڑ چکے ہیں
--- اس کے پتوار فروخت ہو چکے ہیں
--- اس کے تختے گروی ہیں
--- اس کے بادبان سے ناخداؤں کی عبائیں اور دستار بن چکے ہیں
--- اور طوفان بلاخیز موج در موج ہر سمت سے امڈا چلا آ رہا ہے
--- اور تمہاری نگاہیں ساحل مراد کی نہیں راہ فرار کی متلاشی ہیں

اس نازک وقت میں چراغاں کرنے سے پہلے......

--- قوم کی عزت و ناموس کا دامن جو تار تار ہو گیا ہے' اسے رفو تو کر لو۔
--- جن کو تم نے اپنے خزانوں کا امین بنایا ہے ان سے دیانت کی سند تو لے لو۔
--- جنھوں نے تمہارے ہاتھوں میں کاسہ گدائی دیا' ان کی سخاوت اور دریا دلی کی آزمایش تو کر لو۔

دوست دشمن ' اپنے پرائے' کھرے کھوٹے اور حق و باطل کی پہچان اگر ہم اب بھی کر لیں تو شاید طوفان بلاخیز کا رخ بدل جائے ورنہ یہ کشتی--- کشتی نوح نہیں ہے کہ ساحل ہی اس کا مقدر تھا۔

حالات کی اس سنگینی پر بھی ہم نہیں جانتے کہ ہماری مہلت کب تک ہے۔ اللہ کی زمین ان مظالم پر ہمارے پیروں تلے باقی رہے گی یا نہیں۔ اب بھی دم آخر ہم قوم یونس علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے آگے جھک جائیں گے اور باب توبہ پر دستک دے کر باب رحمت میں داخل ہو جائیں گے یا نہیں۔

ہماری سیاسی وابستگی خواہ کچھ بھی ہو' قرآن سے ہمارا رشتہ تو نہیں ٹوٹا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری عقیدت اور محبت ماند تو نہیں پڑی۔ ہمارے گناہوں کا بوجھ گو کم نہیں لیکن اللہ کے بندے تو ہیں۔ مسلمان تو ہیں۔ اسلام سے برگشتہ تو نہیں ہوئے ہیں۔ قرآن کی صداقت اور اس کی آفاقیت کے منکر تو نہیں ہوئے ہیں۔

قرآن کا پیغام' محبت ہے' امن ہے' عافیت ہے' انصاف ہے' اتحاد و اتفاق اور حق شناسی ہے۔ قرآن کا قانون آج کی نام نہاد جمہوریت اور آمریت سے ماورا' انصاف' تحفظ' استقامت اور مساوات کا علم بردار ہے۔

اسی قرآن کے رشتے' اسی اسلام کے رشتے اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور محبت کے رشتے کو استوار کرنے کے لیے تم سب کو آواز دے رہے ہیں۔

اے اللہ! ہماری اس پکار کو' ہماری اس صدا کو' وہ تاثیر عطا فرما جو ہر دل میں اتر جائے اور ہر گوش ہمہ تن گوش بن جائے۔ آمین!

اخبار امت

بھارت میں مسلمانوں کے مسائل

سید جلال الدین عمری

نوے کروڑ کی آبادی کے اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد موجودہ اعداد و شمار کے لحاظ سے بھی بارہ کروڑ ہے۔ ہم اسے 'اقلیت' اصطلاحی معنی میں تو کہہ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ 'اقلیت' کئی ایک مسلم ممالک کی مجموعی آبادی کے برابر ہے۔ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد سوائے انڈونیشیا' بنگلہ دیش اور پاکستان کے کسی مسلم ملک میں بھی نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی آبادی کے ملک ہی دنیا کے نقشے پر بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اب ذرا سوچیے کیا اس بے پناہ آبادی کے مسائل نہیں ہوں گے یا کچھ کم ہوں گے؟ اس امت کے مسائل ہیں اور گوناگوں اور مختلف نوع کے مسائل ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے بھی مسلمانان ہند بہت سے مسائل سے دوچار تھے۔ ۱۹۴۷ کے بعد حالات میں تبدیلی آئی' بعض نئے مسائل پیدا ہوئے اور بعض مسائل نے شدت اختیار کر لی۔

۱۸۵۷ میں انگریزوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہندستان کا اقتدار چھینا تھا۔ مسلمان ان کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور انگریز انھیں اپنا سب سے بڑا حریف بلکہ حکومت کا باغی تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اس مزاحمت کو طاقت کے زور سے جس طرح کچلا گیا' اس خونیں داستان کا بیان بڑا دل خراش اور صبر آزما ہے۔ یہاں اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ انگریزوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمان طاقت نہ حاصل کریں اور ابھرنے نہ پائیں۔ چنانچہ وہ ہر میدان میں پیچھے رہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ پیچھے کیے گئے۔

ملک میں جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو یہ مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اس کے قافلہ سالاروں میں شامل ہو گئے۔ ہر طرح کی قربانیاں دیں اور آبادی میں اپنے تناسب سے کہیں زیادہ آزادی کی قیمت ادا کی۔ یہ سب کچھ اس جذبے کے تحت تھا کہ ملک انگریزوں کی

غلامی سے آزاد ہو جائے تو وہ برادران وطن کے ساتھ سکون اور چین کی زندگی گزار سکیں گے اور ان کے لیے ترقی کی راہیں کھلیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ خوابوں کے شیش محل ٹوٹ گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ آزادی آئی اور بڑے طمطراق سے آئی، لیکن ان کے مسائل حل نہیں ہوئے۔ انگریزوں کے دور میں وہ جہاں تھے، وہیں رہے بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ اس سے بدتر مقام پر پہنچ گئے۔

اگست ۱۹۴۷ میں یہ ملک، بھارت اور پاکستان کے نام سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر آزاد ہوا۔ اس تقسیم نے یہاں کی اکثریت اور مسلمانوں کے درمیان ایک زبردست خلیج پیدا کر دی۔ تقسیم کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا اور کانگریس نے جو اکثریت کی نمایندگی کر رہی تھی بالآخر اس مطالبے کو تسلیم کر لیا اور تقسیم کے معاہدے پر دستخط کر کے اس کی منظوری دے دی۔ اس مشترکہ یا متفقہ فیصلے کے باوجود ایک طبقہ، جو کافی طاقتور تھا اور جس کے اثرات بڑے وسیع تھے، برصغیر کے تمام مسلمانوں کو تقسیم ملک کا ذمہ دار قرار دے رہا تھا۔ اس بحث کو فی الحال نظرانداز کر دیجیے کہ تقسیم کے ذمے دار صرف مسلمان تھے یا ان میں اکثریت کے رہنماؤں کا بھی کوئی قصور تھا۔ بہرحال اس طبقے کے نزدیک مسلمان مجرم تھے اور وہ ان کے اس جرم کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ اس طبقے کا رویہ ان کے ساتھ معاندانہ بلکہ جارحانہ ہے اور وہ ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش تک نہیں کر رہا ہے۔

ان جذبات کے درمیان آزادی کا سورج آگ اور خون کے سمندر میں نہاتا ہوا طلوع ہوا، فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے، بستیاں ویران ہو گئیں، خاندان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ کم از کم پورا شمالی ہند خون سے لالہ زار ہو گیا۔

خیال تھا کہ ملک کی تقسیم سے جو زخم لگے ہیں، وہ وقت گزرنے کے ساتھ مندمل ہو جائیں گے لیکن آزادی کے پچاس برس گزرنے کے بعد بھی فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جس شدت کے ساتھ جاری ہے اور ان فسادات میں جس بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کا نقصان ہوا ہے، اس سے اس خیال کی مسلسل تردید ہو رہی ہے۔ ان حالات میں فطری طور پر مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے اور وہ ایک غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب یہاں ان کی کوئی بھی چیز کسی بھی وقت فسادات کی نذر ہو سکتی ہے۔

دستور ہند کی رو سے مسلمان برابر کے شہری ہیں، لیکن ابھی تک اکثریت کے ایک خاص طبقے کا ذہن یہ ہے کہ جب ملک تقسیم ہو گیا اور مسلمانوں کو پاکستان کی شکل میں ایک الگ خطہ زمین مل گیا تو ہندستان میں مسلمانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ مساوی سلوک کے لیے تیار نہیں ہے۔

تقسیم ہند کی وجہ سے، جس کی ذمے داری صرف مسلمانوں پر نہیں ڈالی جا سکتی، اس کے کچھ اور

اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ اس ملک کا ایک خاص طبقہ مسلمانوں سے مستقل طور پر بدگمان ہے۔ بدگمانی کی عینک سے جب وہ دیکھتا ہے تو اسے مسلمانوں کا پورا کردار مشکوک نظر آتا ہے۔ اور ان کے بے ضرر عمل سے بھی وہ خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس بدگمانی کی وجہ سے ان کی قربانیاں اور خدمات شک و شبہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔ بدگمانی کی اس فضا میں ذرا سی بے احتیاطی سے دونوں قوموں کے درمیان کوئی بھی افسوس ناک واقعہ پیش آ سکتا ہے اور اس کے نتائج سنگین برآمد ہو سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ کے بعد ملک کے اندر جارحیت کا رجحان بڑی شدت سے ابھرا ہے۔ بدقسمتی سے اس ملک کی اکثریت میں یہ رجحان قوی سے قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس رجحان کو کنٹرول کیا جائے اور اس کی اصلاح کی تدابیر کی جائیں، اقلیت کو متعصب، تنگ نظر، جارح اور ظالم قرار دیا جاتا ہے تاکہ اپنی جارحیت کے لیے وجہ جواز فراہم کی جا سکے اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ اکثریت کے اندر جارحیت ہے تو ردعمل ہے اقلیت کی جارحیت کا۔ اس کے لیے مسلمانان ہند کی پوری تاریخ کو بڑی بھیانک شکل دی جا رہی ہے اور اسے ہندو مسلم کش مکش کی تاریخ بلکہ مسلمانوں کے ظلم و بربریت اور برادران وطن کی مظلومی اور محکومی کی تاریخ میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔

یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مسلمانوں کا دامن ہر عیب سے پاک ہے، ان سے غلطیاں نہیں ہوئیں یا نہیں ہوتیں، وہ جذبات میں مشتعل نہیں ہوتے یا ان سے جارحیت کا کبھی ارتکاب نہیں ہوتا۔ لیکن کسی فرد یا کچھ افراد کی غلطی کی وجہ سے پوری قوم کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ مجرموں کا سلوک کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ جس قوم کے ہاتھ میں اقتدار ہو اسے بڑا فراخ دل اور وسیع الظرف ہونا چاہیے۔ جو قوم دوسروں کا احتساب کرنے اٹھے، اسے پہلے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔

جارحیت کے اس رجحان سے مسلمانوں کو سخت نقصانات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنی دینی، سیاسی، سماجی اور معاشی ضروریات کے تحت بہت سے ادارے قائم کیے ہیں۔ ان اداروں کو انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے۔ ان کے تہذیبی مراکز بھی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہاں سے انھیں دین و ایمان کی دولت بھی ملے اور ان کی مادی ضروریات بھی پوری ہوں۔ لیکن ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے، ان کی امتیازی خصوصیات کو پسند نہیں کیا جاتا۔ ان میں حکومت کا عمل دخل اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اقلیتی اداروں کی حیثیت سے انھیں چلانا مشکل ہے۔

۲۔ اردو، ہندستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کی مادری زبان ہے۔ یہ ان کا فطری اور دستوری حق ہے کہ اسے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور اردو بولنے والوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک

نہ کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے اس زبان کی اہمیت دینی لحاظ سے بھی ہے۔ یہ اپنے دامن میں دینی علوم کا بڑا مستند ذخیرہ رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ اپنے دین سے با آسانی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اردو کے مراکز میں بھی اس کے ساتھ جو بے التفاتی بلکہ ناانصافی ہو رہی ہے اور ہندی کے فروغ کے نام پر اسے ختم کرنے کی جس طرح کوشش کی جا رہی ہے' اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تنگ نظری اور جارحیت کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی مسائل ہیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے' جیسے تعلیم کا مسئلہ' معاش کا مسئلہ' ملازمتوں میں تناسب کا مسئلہ وغیرہ۔

بعض مسائل کا مسلمانوں کے دین سے براہ راست تعلق ہے۔ ان مسائل کی وجہ سے وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب ہیں کہ ایک خاص دائرے میں انھیں اپنے دین پر عمل کی ازروے دستور جو آزادی حاصل ہے' اس پر بھی شب خوں جاری ہے اور وہ ہر وقت خطرے میں ہے۔

۱۔ کتنی ہی مساجد سے مسلمانوں کا عمل دخل ختم ہو چکا ہے اور کتنی ہی مساجد آثار قدیمہ میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اسی جارحیت کا بدترین مظاہرہ بابری مسجد کے سلسلے میں سامنے آیا۔

۲۔ مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے دین کا ایک حصہ ہے۔ یہ انگریزوں کے دور حکومت میں بھی محفوظ رہا لیکن اب یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ مسلم پرسنل لا میں بہت سی باتیں قابل اصلاح ہیں' ان کی اصلاح ضرور ہونی چاہیے ورنہ ملک ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ پورے ملک کے لیے یکساں سول کوڈ پر اصرار کیا جاتا ہے اور دستور ہند کے رہنما اصولوں میں اس کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانان ہند کے لیے سب سے زیادہ تشویش کا باعث ہے۔ جو لوگ مسلم پرسنل لا میں ترمیم چاہتے ہیں وہ دراصل اسلامی شریعت میں ترمیم چاہتے ہیں۔ اس ترمیم کا حق مسلمانوں کے نقطہ نظر سے نہ کسی فرد کو حاصل ہے اور نہ کسی ریاست کو۔ دوسری بات یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ اس ملک میں جب بھی بنے گا وہ اکثریت کی روایات اور اس کے رجحان کے تابع ہو گا۔ ایک کمزور قوم اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ یکساں سول کوڈ کا مطلب ہے مسلمان اقلیت کا اکثریت کے تابع ہو جانا۔

۳۔ اس بات کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے بنیادی سرچشموں سے بدگمان کر دیا جائے اور یہ بات ذہنوں میں بٹھا دی جائے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات اس دور میں اور ملک کے موجودہ حالات میں ناقابل عمل ہیں۔ اب تو یہ بات باور کرائی جا رہی ہے کہ قرآن و حدیث میں ایسا مواد پایا جاتا ہے جو ملک کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ ہے اور مسلمانوں کو دوسری قوموں سے برسرپیکار رکھتا ہے۔ اس مواد کو حذف ہونا چاہیے یا اس میں مناسب ترمیم ہونی چاہیے۔ ان خرافات کی تائید بعض اوقات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے نام بدقسمتی سے مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس تائید کا انھیں صلہ بھی مل جاتا ہے حالانکہ ان

میں سے کسی کا مسلمانوں کے اندر کوئی وقار نہیں ہے۔

اس طرح کے اقدامات سے مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ان کا دین، ان کے مقدس مقامات اور ان کی مقدس کتابیں سب جارحیت کی زد میں ہیں۔ کسی بھی وقت ان کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہاں اکثریت کے خاص ذہن کا ذکر ہے جو موثر اور طاقتور ہے جس کے اثرات سے اکثریت پوری طرح آزاد نہیں ہے، ورنہ اکثریت میں ایسے افراد بھی ہیں جنھیں کمزوروں کے ساتھ ہمدردی ہے اور جو نہیں چاہتے کہ کسی طبقے کو ظلم و ستم کا ہدف بنایا جائے اور اس کی ترقی کی راہیں روک دی جائیں۔ لیکن یہ طبقہ موثر نہیں ہے یا اس میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ظلم کے خلاف برملا آواز اٹھائے اور کھل کر مظلوم کا ساتھ دے۔ ملک کی خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ یہ طبقہ مضبوط ہو۔ جب تک یہ مضبوط نہ ہو، صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آ سکتی۔

ان مسائل کو حل کرنے کے لیے مسلمانوں کی طرف سے عملاً جو کوششیں ہو رہی ہیں یا جو کوششیں وہ کرنا چاہتے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خود مسلمان اپنے ان مسائل سے کماحقہ واقف نہیں ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ وہ ان سے بے خبر ہیں۔ جو قوم اپنے مسائل ہی سے بے خبر ہو، وہ انھیں حل کیا کرے گی؟ لہٰذا انھیں ان مسائل سے باخبر کرنا اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ وہ غفلت کی نیند سے جلد بیدار ہوں ورنہ ان کی متاع حیات لٹ جائے گی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔

۲۔ ملک کی اکثریت کو مسلمانوں کے مسائل سے آگاہ کیا جائے اور بہ حسن و خوبی انھیں سمجھایا جائے کہ وہ کن مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ان کی مشکلات حقیقی ہیں، فرضی نہیں ہیں۔ ان کی باتوں کو ایک حریف قوم کا شور و غوغا سمجھ کر وہ کان بند نہ کر لیں بلکہ آنکھیں کھول کر ان کے حالات کا جائزہ لیں اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ کسی جمہوری ملک میں اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اپنے حقوق کے لیے دستوری جدوجہد کی جائے۔ دستور ہند نے اقلیتوں کو جو ضمانتیں دی ہیں وہ مسلسل پامال ہو رہی ہیں۔ ان ضمانتوں کو بحال کرایا جائے اور حکومت اور انتظامیہ کو ان کا پابند بنانے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ انتخابی سیاست کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے۔ جمہوریت میں ووٹ کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی ایک طاقت ہوتی ہے۔ اب تک مسلمانوں کی اس طاقت سے اغیار فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور انھوں نے آنکھیں بند کر کے ان کے حق میں ووٹ دیا ہے لیکن اب اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے اس طاقت کو استعمال کریں۔ صرف انھی امیدواروں اور پارٹیوں کو ووٹ دیں جو ان کے حقوق کی حفاظت کی ذمے داری لیں۔

۵۔ اپنے حقوق کے لیے جمہوری طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اس میں جلسے، جلوس، مظاہرے، احتجاج وغیرہ تمام معروف ذرائع آسکتے ہیں۔

یہ تمام کوششیں کسی نہ کسی درجے میں کی جا رہی ہیں بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ مسلمانوں کی سیاست ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کوششیں منظم طریقے سے ہوں تو ان کے کچھ نہ کچھ نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت میں یہاں بعض دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔

یہ ساری کوششیں امت کے بقا اور تحفظ کی ہیں۔ یہ اس لیے ہیں تاکہ اس ملک میں مسلمانوں کا وجود باقی رہے، ان کا اثاثہ محفوظ رہے، ان پر کسی طرف سے کوئی حملہ نہ ہو۔ وہ معاشی، تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے کسی گراوٹ اور پستی میں مبتلا نہ ہوں بلکہ ترقی کریں اور آگے بڑھیں۔ یہ ایک بہت ہی پاکیزہ مقصد ہے۔ اس کی اہمیت سے کوئی بھی ایسا فرد جسے ملت سے تھوڑی سی بھی ہمدردی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ بظاہر حالات ایک طویل جدوجہد کی طالب ہیں۔ ہم نے پچاس برس کے عرصے میں بہت تھوڑا سا راستہ طے کیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ منزل بہت دور ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کسی وقت یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے تو سوال یہ ہے کہ کیا کچھ اور مسائل اسی نوعیت کے یا ان سے سخت نوعیت کے پیدا نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارا کام صرف ان مسائل کو حل کرنا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا کام امت کے سامنے نہیں ہے؟

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جس امت کے بقا و تحفظ کی کوشش ہو رہی ہے، اس کا ایک مقصد حیات ہے۔ اسی نے اسے ایک امت بنایا ہے اور اسی میں اس کی بقا کا سامان بھی ہے۔ قوموں کو نہ تو مسائل زندہ رکھتے ہیں اور نہ وسائل۔ ان کی زندگی ان کے اعلیٰ مقاصد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے مقصد حیات کو فراموش کر بیٹھے، اس کی بقا کی ساری جدوجہد ناکام ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ امت اپنے مقصد حیات کو نہ بھولے بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی جدوجہد کرتی رہے۔ اس جدوجہد میں اس کا مرمٹنا ہی اس کی کامیابی ہے۔

کہا جا سکتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت اصل مسئلہ امت کے بقا و تحفظ کا ہے۔ دوسرے مسائل اس کے بعد کے ہیں۔ جس شخص کی جان پر بن آئے اور جو شدید کش مکش حیات سے دوچار ہو یا فقر و فاقہ نے جس کی کمر توڑ رکھی ہو، اس کے سامنے مقصد حیات کی بحث کرنا فضول ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس غور و فکر کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا۔

ہماری درخواست صرف یہ ہے کہ ان کے خیر خواہ اور مخلص اس کی جان بچانے کی ضرور فکر کریں اور اس کی غربت و افلاس کا علاج بھی ڈھونڈیں لیکن ساتھ ہی اس کے دین و اخلاق کی طرف بھی توجہ دیں ورنہ اس کا امکان ہے کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس زوال یافتہ معاشرے کا ایک عام فرد ثابت ہو اور

وسائل حیات فراہم ہو جانے پر تو اس کا بھی خطرہ ہے کہ وہ دوسروں سے بدتر نکلے۔ امت کا ہر فرد اس کا بڑی قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے لیے اس کی اس طرح تربیت ہونی چاہیے کہ امت کے مقاصد کو وہ ہمیشہ پیش نظر رکھے اور کسی قیمت پر اس کے مفاد کو نقصان نہ پہنچنے دے۔

اس معاملے میں فرد اور قوم کے درمیان فرق کرنا بھی ضروری ہے۔ مسائل و مشکلات، ہو سکتا ہے کسی فرد کو کچل کر رکھ دیں لیکن بامقصد قوموں کو حیات تازہ عطا کرتی ہیں۔ حالات کی ہر چوٹ ان کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور وہ زیادہ قوت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں۔ اقبال تو ہر فرد سے کہتے ہیں: "اگر خواہی حیات اندر خطرزی"۔ یہ اصول فرد سے زیادہ قوموں پر منطبق ہوتا ہے۔ بامقصد قوم کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ رکاوٹ جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی دفاعی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ آگے بڑھنے کی راہیں خود بخود نکالتی چلی جاتی ہے۔ جو قوم مسائل و مشکلات میں الجھ کر اپنے مقصد حیات ہی کو بھول جائے وہ تادیر باقی نہیں رہ سکتی۔

اس امت کا مقصد حیات کیا ہے؟ اس کا جواب خدا اور رسولؐ نے بہت واضح الفاظ میں دیا ہے۔ اسے دو دفعات میں بیان کیا جا سکتا ہے: ایک، اسلام کی طرف بازگشت اور دوسرے، اسلام کی دعوت۔

اسلام کی طرف بازگشت یہ ہے کہ اسلام کی طرف، جس سے ہم بہت دور ہو چکے ہیں، پھر سے ہم پلٹ آئیں اور اس طرح پلٹ آئیں کہ اپنی پچھلی بے راہ روی کی تلافی ہو جائے۔ اس طرح اسے سینے سے لگائیں اور اس طرح چمٹیں جیسے عزیز ترین متاع گم شدہ اچانک ہاتھ آگئی ہو۔ اپنی شخصیت کو بے چون و چرا اور بالکلیہ اس کے حوالے کر دیں تاکہ اس پر اس کا اور صرف اسی کا حکم چلے۔ اپنے معاملات کی زمام اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس کے ذرا سے اشارے پر دوڑ پڑیں اور جس طرف بڑھنے سے وہ منع کرے اس طرف اٹھے ہوئے قدم بھی رک جائیں۔ ہماری پوری زندگی پر اسی کی فرماں روائی ہو اور زندگی کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو اس کے آزاد نہ رہنے پائے۔ اس کی حکومت ہماری شخصیت پر ہو، ہمارے فکر و عمل پر ہو، ہمارے بیوی بچوں اور خاندان پر ہو، ہمارے لین دین اور کاروبار پر ہو، ہمارے اداروں اور ہماری تنظیموں پر ہو۔ غرض یہ کہ جہاں تک ہمارا بس چلے ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی میں اسلام ہی اسلام نظر آئے اور جن دائروں میں ہم اسلام قائم کر سکتے ہیں، ان میں عملاً قائم ہو جائے۔ اس راہ میں جان، مال، جذبات، تعلقات، جاہ و منصب، رسوم و رواج، ہر چیز کا نقصان برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

یہ بازگشت، اسلام کو ماننے کا فطری تقاضا ہے۔ اس کے بغیر اسلام کا دعویٰ کھوکھلا دعویٰ ہو گا۔ اس کے بغیر ثمرات کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر اسی بازگشت کے ذریعے امت کو ایک نقطے پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ امت کے اندر اسلام کا شعور جتنا زیادہ ہو گا اور ان کی زندگیوں میں وہ جس قدر نمایاں ہو گا، اس کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو گا اور افتراق و انتشار کی ماری ہوئی یہ امت ایک نقطے پر جمع ہو سکے گی۔ یہی اتحاد اس

کے موجودہ مسائل کے حل کا قوی ترین اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ ان مسائل کے حل کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ امت صرف اسلام ہی کی بنیاد پر متحد اور متفق ہو سکتی ہے۔ کسی اور بنیاد پر متحد ہونا اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح کا اتحاد وقتی طور پر پیدا ہو بھی جائے تو وہ دیرپا نہیں ثابت ہوتا اور بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔

یہ اسلام جسے ہماری زندگی میں پوری طرح اتر جانا چاہیے اور جس کا ہمیں عملی نمونہ بن جانا چاہیے' اسی کی ہمیں دوسروں کو دعوت دینی ہے۔ اس کا مطلب وعظ و تبلیغ اور فضائل و مناقب کا بیان نہیں ہے بلکہ اسلام کو اس طرح پیش کرنا ہے کہ وہ جدید ہندستان کے سوالوں کا جواب بن جائے۔ آج یہ ملک گوناگوں مسائل اور مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ آپ کو یہ ثابت کرنا ہو گا کہ اسلام ان مسائل و مشکلات سے اسے نکال سکتا ہے۔ انسان کی زندگی اس کے عقائد کے تابع ہوتی ہے۔ اس ملک کی اکثریت الحاد و دہریت' شرک اور اصنام پرستی اور متعدد خرافات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام توحید خالص کا صاف ستھرا عقیدہ پیش کرتا ہے۔ یہ عقیدہ ایک طرف تو عقل و منطق کی میزان پر پورا اترتا ہے اور انسان کے دل و دماغ کو مطمئن کرتا ہے اور دوسری طرف خدا سے اس کائنات اور انسان کے رشتے کو واضح کرتا ہے۔ اس رشتے کو کھولنے سے جدید اور قدیم فلسفے عاجز ہیں۔ آپ عقیدۂ توحید کو ہندستان میں اس طرح پیش کریں کہ وہ اس کے عقائد و افکار کا بدل بن جائے۔

یہ ملک سیاسی' سماجی' تہذیبی اور لسانی لحاظ سے افتراق کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے سے شاکی اور ایک حصہ دوسرے حصے سے برسرپیکار ہے۔ دل پھٹ چکے ہیں' منافرت اور تعصب کی آگ ہر طرف بھڑک رہی ہے۔ ان حالات میں بظاہر اس ملک کو متحد اور ایک وحدت بنائے رکھنے والی کوئی طاقت نہیں ہے۔ البتہ اسلام اس ملک کو جوڑنے والی طاقت بن سکتا ہے۔ وہ یہ تصور دیتا ہے کہ سارے انسان رنگ' نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کی اولاد ہیں۔ سب کی نجات اسی ایک خدا کی عبادت اور بندگی میں ہے۔ آپ کو ثابت کرنا ہو گا کہ اسی تصور کے ذریعے ملک کو اختلاف اور انتشار سے بچایا جا سکتا ہے اور اس کے اتحاد کو باقی رکھنا ممکن ہے۔

ہندستان نے سیاست میں مغرب کے جمہوری نظام کو اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور کے انسان کی رسائی یہیں تک ہی ہو سکی ہے۔ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکا ہے لیکن انسانی فکر کبھی لغزشوں سے پاک نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس کا جمہوری نظام خوبیوں کے ساتھ اپنے اندر بہت سی خامیاں بھی رکھتا ہے۔ ان خامیوں کا اعتراف خود مغربی مفکرین کو ہے لیکن اس کا کوئی بدل ان کے پاس نہیں ہے۔ ان ہی خامیوں کی وجہ سے علامہ اقبال نے کہا:

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

"طرز جمہوری سے پرہیز کرو۔ کسی مرد پختہ کار کا دامن پکڑ لیوں کہ دو سو گدھے مل کر بھی ایک انسان کی طرح نہیں سوچ سکتے"۔

اسلام جمہوریت کو اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کا پابند بناتا ہے اور فرد اور ریاست دونوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ یہ تصور ان خرابیوں سے پاک ہے جو موجودہ جمہوریت میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کا فرض اور ملک کی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ آپ ہر سطح اور ہر موڑ پر اس کی بھرپور وکالت کریں اور اس کی حقانیت کا ثبوت فراہم کریں۔

ہندستان نے معاشی میدان میں سوشلزم کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کے ساتھ وہ سرمایہ دار نظام سے اپنا رشتہ توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ اس بحث سے قطع نظر اپنی ساری کوششوں کے باوجود یہ نظریات اس کے معاشی مسائل حل نہیں کر سکتے ہیں' آپ کو بتانا ہو گا کہ سوشلزم اور سرمایہ داری کے مقابلے میں اسلام معیشت کی بہترین بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ اس کو اختیار کر کے انسان اس راہ کی ناہمواریوں سے بچ سکتا ہے۔ اسی طرح موجودہ قانون کے مقابلے میں اسلامی قانون کی اور موجودہ ضابطہ اخلاق کے مقابلے میں اسلام کے ضابطہ اخلاق کی' غرض زندگی کے ہر گوشے میں اسلام کی برتری ثابت کرنا آپ کا فرض ہے۔

اس طرح آپ اسلام کو ایک متبادل نظام کی حیثیت میں اہل وطن کے سامنے پیش کر سکیں گے اور یہ ثابت کر سکیں گے کہ آپ کے پاس وہ دولت ہے جو کسی طبقے یا کسی جماعت کے پاس نہیں ہے۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ ہندستان یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ آپ کا مقام' قیادت اور رہنمائی کا ہے۔ آپ اس سے اپنے حقوق کے طالب ہی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں اسے کچھ دینے کی بھی پوزیشن میں ہیں۔ اس سے آپ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ عظمت اور برتری آپ کے ساتھ چلے گی۔ آپ برابر کی سطح سے بلکہ اونچی سطح سے بات کر سکیں گے۔ یہ ملک آپ کو قائد اور رہنما کی حیثیت سے دیکھے گا اور آپ' اللہ نے چاہا تو اس کے محسن اور نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کی جدوجہد شروع ہوتے ہی اس ملک میں امت کے موجودہ مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اس وقت بھی مسائل ہوں گے' موجودہ مسائل سے زیادہ ہوں گے اور شدید تر ہوں گے' آپ کی دعوت کو چیلنج کیا جائے گا' اعتراضات کی بوچھاڑ ہو گی' آپ کی چھوٹی بڑی ایک ایک کوتاہی زیر بحث آئے گی اور رکاوٹ بنے گی' آپ پر مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کا الزام عائد ہو گا۔ آپ پر سختیاں ہوں گی حتیٰ کہ دار و رسن ہو گا۔ لیکن اسی میں اسلام کے ساتھ آپ کے تعلق اور خلوص کا امتحان بھی ہو گا اور اسی سے امید ہے بدگمانیاں دور ہوں گی اور اسلام کے فروغ کی راہیں کھلیں گی۔ دعا ہے کہ ہم اس امتحان میں کامیاب ہوں۔

سلسلے میں ہونے والی کوششوں میں کسی خاص کامیابی کے نہ ہونے کی وجوہ گنوائی ہیں، اور کچھ مثبت تجاویز پیش کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا: "تعلق معیشت دانوں کے اس گروہ سے ہے، جو اسلامی بنک کاری کی تحریک کو اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود ایک مثبت تبدیلی اور مستقبل کے لیے امید افزا سمجھتا ہے" (ص ۵۷)۔

لیکن مروجہ سودی بنک کاری اور معیشت کی اس آکاس بیل سے آگاہی اور اس کے "جیون رس" چوسنے والے اس کردار کے پورے شعور کے باوصف جب بقول ان کے امید افزا بات یہ نظر آتی ہے کہ: "اکیسویں صدی میں اسلامی اور روایتی بنکوں کے درمیان بڑے پیمانے پر تعاون اور باہمی صحت مندانہ مقابلے کو فروغ ہو گا" نیز یہ کہ: "اپنے اختلافی حالات اور نظریات کے باوجود روایتی بنکوں اور اسلامی بنکوں کو ایک دوسرے کا حریف نہیں سمجھنا چاہیے، (کہ) یہ دونوں مسلم اور مغربی دنیا میں روشن مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن سکتے ہیں" ---- تو ایک اضطراب انگیز حیرانی ہوتی ہے۔ پروفیسر خورشید کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنی فکر اور مطالب کے اظہار کے سلسلے میں کسی الجھاؤ کا شکار ہو سکتے ہیں!

سوال یہ ہے کہ کیا نظام ربو جسے قرآن، اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے مترادف قرار دیتا ہے---- پر مبنی بنک کاری اپنے آخری تجزیے میں، اور مآل کار کسی فلاح اور "روشن مستقبل" کی نوید کا باعث ہو سکتی ہے؟ اور کیا "حسنہ" اور "سیئہ" ایک دوسرے کے حریف کی بجائے حلیف ہو سکتے ہیں؟

مقالہ نگار کی وضاحت

میں اپنے عزیز و محترم بھائی، عبدالقدیر سلیم کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مضمون کے جن جملوں کے بارے میں اضطراب محسوس کیا ان کی نشاندہی کر دی اور اس طرح مجھے اپنے موقف کی وضاحت کا موقع مل گیا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ

بلاشبہ سودی نظام اور اس پر مبنی بنک کاری اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ ہے جس کے یہ معنی بھی ہیں کہ انسانیت کے خلاف اعلان جنگ ہے اور اس سے فرد اور معاشرہ دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں نے اسلام کی روشنی میں معیشت کا جو نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں قرض پر مبنی معیشت کی جگہ نفع و نقصان میں شراکت پر مبنی معیشت کا تصور مرکزی اہمیت کا حامل ہے اور بلاشبہ سودی معیشت میری نگاہ میں سیئہ اور نفع و نقصان پر مبنی معیشت حسنہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میری نگاہ میں یہ دونوں معیشت کے بالکل مختلف منہج ہیں۔ میں سودی نظام کی جگہ نفع و نقصان پر مبنی سرمایہ کاری اور بنک کاری کو بطور متبادل پیش کر رہا ہوں اور حالیہ تجربات میں جہاں جہاں اس اصل کی میزان پر کمی محسوس کرتا ہوں اس پر صاف الفاظ میں تنقید و احتساب بھی کر رہا ہوں۔ ایک حقیقت پسند معاشی مبصر کی حیثیت سے

مجھے ان امور کی طرف بھی اشارہ کرنا پڑا، جن کا تعلق فوری امور اور عبوری دور سے ہے۔ اصل منزل اور ہدف اور ابتدائی اور عبوری معاملات میں فرق عقل و تجربے کا بھی تقاضا ہے اور اللہ کا دین بھی زندگی کے ان پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے اور شریعت کی تطبیق میں حکمت اور تدریج کو نظرانداز نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود حالیہ تجربات کو جو ابھی مکمل طور پر اسلامی بنک کاری کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے ہیں اور زیادہ سے زیادہ قانونی سود سے پاک معاملات کی طرف ایک اولیں اور ابتدائی قدم کی حیثیت رکھتے ہیں، میں ایک مثبت اقدام تصور کرتا ہوں، نیز ضروری تنقید کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں اور ان کو اگلے قدم اٹھانے کی ترغیب دیتا ہوں۔ اس طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ بنک کسی خلا میں کام نہیں کر رہے۔ انھیں روایتی بنکوں سے سو طرح کے معاملات کرنا پڑ رہے ہیں اور اس میں ان کی کوشش یہ ہے کہ روایتی بنکوں سے بھی چند مشترک اصولوں اور ضابطوں کے مطابق معاملہ کریں--- یعنی ایسے اصول اور ضابطے جو دونوں کے لیے قابل قبول ہوں، حالانکہ روایتی بنک کاری کا باقی کام سود اور حرام پر مبنی ہے۔ زیر گفتگو مضمون میں بھی میں نے اس سلسلے میں تین اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(ا) روایتی بنک کاری میں بھی کچھ معاملات ایسے ہیں جو مبنی بر سود نہیں، مثلاً صنعت میں بلاواسطہ شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری جس کی بہت واضح روایت جرمنی اور فرانس میں موجود رہی ہے اور جس کے ذریعے جرمنی کی Rhine Valley کی صنعت کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا گیا یا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک (جو خالص سودی قرض دیتے ہیں) کے مقابلے میں آئی ایف سی جو صنعت میں حصہ داری کی بنیاد پر سرمایہ فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح روایتی بنکوں کی وہ سرگرمیاں ہیں جو سرمایہ کاری بنک کاری سے متعلق ہوں اور مبنی بر سود نہ ہوں۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں تعاون ہو سکتا ہے۔ یہ حسنہ اور سیئہ کو خلط ملط کرنے کے مترادف نہیں ہے بلکہ سیئہ سے بچتے ہوئے حسنہ کی حد تک تعاون کی راہیں تلاش کرنے کی ایک سعی ہے۔

(۲) روایتی بنک بہت سی ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جو عالمی تجارت اور سرمایہ کاری کے لیے بے حد ضروری ہیں لیکن ان میں بلاواسطہ سود کا کوئی دخل نہیں۔ ان میں بین الاقوامی تجارت کے لیے کرنسیوں کا تبادلہ، زر کی ترسیل، انشورنس، دستاویزات کی تیاری، قانونی رہنمائی، تجارتی روابط اور تعلقات میں معاونت وغیرہ شامل ہیں۔ ان خدمات کا وہ معاوضہ بھی لیتے ہیں۔ چونکہ دنیا میں ہر جگہ اسلامی بنک موجود نہیں اس لیے اسلامی بنکوں کو روایتی بنکوں سے ان تمام معاملات میں تعاون حاصل کرنا ہو گا اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ تعاون کا ایک ایسا میدان ہے جس میں سیئہ سے دامن بچا کر مسلمان تاجر، بنک کار اور ملک اپنی حقیقی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں۔

(۳) بنکوں کے علاوہ بہت سے مالیاتی ادارے اور تنظیمات آج دنیا میں عالمی معیشت کے فروغ میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں جو شراکت، لیزنگ یا دوسری ایسی صورتوں میں معاشی معاملات کر رہے ہیں جو شریعت سے متصادم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں unit trusts اور investment house خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان تمام اداروں سے ایسا تعاون ممکن ہے جس کے نتیجے میں مسلمان ممالک اور خود مغربی ممالک بھی حقیقی معاشی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اب یورپ اور امریکہ کے چند چوٹی کے بنک، مثلاً سٹی بنک، یونین بنک، سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے بعض بنک اور متعدد مرچنٹ بنک سرمایہ کاری کی ایسی basket بازار میں لا رہے ہیں جو سود سے پاک ہے۔ گذشتہ دس سال میں اس سلسلے میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بلاشبہ ان بنکوں کا مقصد ہمارے مقاصد کے مقابلے میں مختلف ہے اور صرف ایک نفع آور موقع سے فائدہ اٹھانا بلکہ اسلامی بنک کاری کی مارکیٹ میں اپنا حصہ لینا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک جائز میدان میں تعاون پیدا کرنے کا ذریعہ بن رہا ہے اور اس سے صرف نظر کرنا دانش مندی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے میدان ہیں جہاں میں تعاون اور اشتراکیت کی بات کر رہا ہوں تاکہ روے زمین سے ظلم اور استحصال کا خاتمہ ہو سکے، غربت دور ہو، اور معاشی اور سماجی فلاح کو فروغ ہو۔ میرے تصور کے روشن مستقبل کا تعلق سودی سرمایہ داری کے مقابلے میں ان اور دوسری متبادل صورتوں کے ذریعے ترقی اور فلاح کی راہوں کی تلاش سے ہے اور میں صرف ان میدانوں میں اور ان اصولوں کی روشنی میں جن پر ہمارا معاشی نظام مبنی ہے، معاونت اور باہمی مدد کا قائل ہوں، مطلقاً ہر میدان میں اور خصوصیت سے سودی بنیاد کو مستحکم کرنے اور فروغ دینے والے معاملات میں تعاون کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔

اصل مضمون انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا جو پہلے بحرین میں ایک عالمی کانفرنس میں اکتوبر ۱۹۹۶ میں پیش کیا گیا جس میں اسلامی بنک کار اور مسلمان ماہرین معاشیات کے علاوہ مغربی بنک کار اور ماہرین معاشیات بھی موجود تھے۔ مضمون پر خاصا طویل بحث و مباحثہ رہا۔ پھر ضروری نظرثانی اور چند اضافوں کے ساتھ ایسوسی ایشن آف مسلم سوشل سائنٹسٹس کی کانفرنس (جنوری ۹۷، کراچی) میں پیش کیا گیا۔ اس میں اپنے لوگوں سے گفتگو کے ساتھ ساتھ بیرونی اداروں اور غیر مسلم اہل علم سے بھی مکالمہ پیش نظر تھا۔ اس لیے اختلاف کے پہلوؤں کے ساتھ ان دائروں کی نشاندہی بھی کی گئی جہاں اصولوں پر سمجھوتے کے بغیر تعاون ممکن ہے۔ میری معروضات کا تعلق انھی مشترک امور سے ہے اور اس کو میں صحت مند مقابلے اور تعاون کا میدان سمجھتا ہوں۔ میرے تصور میں ایسا تعاون نہیں جو اپنے اصولوں کو قربان کر کے وجود میں آتا ہو، میں تو اس کا قائل ہوں کہ۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

(۲)

اقبال اور سیکولر دانش ور

وحید الدین سلیم

"کتاب نما" (مئی ۹۷) میں "اقبال ایک مسلم سیاسی مفکر" پر مختصر مگر جامع تبصرے میں رفیع الدین ہاشمی نے مشیر الحق کے افکار پریشاں پر خوب گرفت کی ہے۔ باوجود اس کے' چند مقامات قابل توجہ رہ گئے ہیں۔ خطبات: "تشکیل جدید الٰہیات اسلام" کے متعلق ایک مدت دراز سے علماے قدیم و جدید کے درمیان بحث و گفتگو کا جو سلسلہ چلا ہے' اس میں ابھی تک یکسوئی پیدا نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں میرا خیال یہ ہے کہ خطبات پر نقد و تبصرے سے پہلے ان پر درج پیش لفظ کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔ اقبال کی یہ مختصر سی نگارش بھی لفظ و معنی کے لحاظ سے بہت بلیغ و خیال افروز ہے۔

جو دانش ور آج کل "خطبات اقبال" کو ایک فیصلہ کن درجہ دینے لگے ہیں اس کی ایک وجہ اقبال کا اجتہاد پر زور ہے۔ مشیر الحق ایسے لوگ دین و شریعت میں تبدیلی کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ سے راست ایسا مطالبہ کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کے لیے اقبال کو ڈھال بنانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اقبال نے ایسے ہی بے توفیق لوگوں کے لیے کہا تھا کہ ۔

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں

اقبال جہاں اسلامی قانون کے فریم میں اجتہاد پر زور دیتے ہیں وہاں نفاذ شریعت بھی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے انھوں نے ایک علیحدہ مملکت کا تصور ہی اس بنا پر پیش کیا تھا کہ اس قطعہ ارض پر شریعت محمدیؐ کو نافذ کیا جا سکے۔ اقبالؒ نے اپنے خطبات کے ذریعے خود مسلمانوں کو اور ان کے واسطے سے ساری دنیا کو خیالات کے خارزار سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس تناظر میں خطبات کے متعلق عہد جدید کے عظیم اسلامی مفکر' مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی یہ رائے ہمارے زاویہ نظر کو درست کر دیتی ہے۔ مولانا رقم طراز ہیں: "یہ خطبات ایک ایسے زمانے میں تحریر کیے گئے تھے جب کہ اسلامی فکر و نظر اور دستور حیات پر مغرب کی یلغار نے دنیاے اسلام میں بڑی انقلاب انگیز شکل اختیار کر لی تھی اور اس پر ایک ہلچل برپا تھی۔ اس وقت جو ابتدائی کوششیں اسلامی عقیدے اور نظام فکر و عمل کو از سرنو مرتب کرنے کے لیے کی گئیں' ان میں علامہ مرحوم کے ان خطبات کا بڑا اہم مقام ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ یہ ترتیب جدید بالکلیہ درست تھی۔ اس میں وقت کے حالات کا اثر بھی پایا جاتا ہے اور بعض مسائل کے بیان میں بھی خامیاں ہیں۔ اس لیے اگر کوئی اسے فکر اسلام کی ترتیب نو کے معاملے میں حرف آخر سمجھے تو غلط ہو گا۔

البتہ اس طرز خاص کے لٹریچر میں مقدمہ الجیش کی حیثیت سے اس کی قدر ناقابل انکار ہے"۔

ہاشمی صاحب نے اپنے تبصرے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ: "علامہ اقبال اسلام کی نشوونما کے لیے اجتہاد کو ضروری سمجھتے تھے"۔ (ص ۷۸) ہماری رائے میں یہاں "اسلامی ذہن کو متحرک رکھنے" یا "فکر اسلامی کے فروغ و پیش قدمی کے لیے" لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ اقبال، شاعر، فلسفی و مفکر، سیاست دان اور ایک داعی حق کی حیثیت سے تاریخ امت ہی نہیں بلکہ تاریخ علم و دانش کا روشن باب ہیں۔ اقبال اپنے علم و فکر و اخلاص کی طاقت سے دنیا کو متاثر کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور آج بھی ان کی شاعری، تاثر کا جادو جگا رہی ہے۔ اقبال کی عملی زندگی کے نقوش برصغیر ہی پر نہیں، عالمی مسائل پر بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اندر ایسی مقناطیسیت تھی کہ ایک جانب مولانا ابوالاعلیٰؒ ایسی جلیل القدر شخصیت کو دکن سے کھینچ کر پنجاب پہنچا دیا تو دوسری طرف محمد علی جناحؒ ایسی عظیم ہستی کو تاریخ ساز کردار ادا کرنے پر اکسایا۔ ہندستان میں ایک مسلم مملکت کے خواب کی تعبیر کچھ آسان نہ تھی۔ اس محاذ پر انگریز اور برہمن سیاست دانوں سے بہ یک وقت ٹکر تھی۔ ایسے میں جب علمائے ہند کے ایک گروہ کی طرف سے وطنیت کے سہارے، مزاحمت کی گئی تو اقبال نے اس پر اپنی شاعری کے ذریعے ضرب لگائی۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست   اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اب اگر اقبال کے خلاف دو سو کتابیں بھی لکھی جائیں تو ان کے مقام کو متاثر نہیں کیا جا سکے گا۔ اقبال عملی سیاست داں کی حیثیت سے جاہلی افکار و اعمال کی وسعت و پھیلاؤ سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ دنیا کے مستقبل پر اسلام کی گرفت ہوگی اور یہ قانون اسلامی کی تحریکیت کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لیے اقبال نے اسلامی قانون کے مسائل پر تخلیقی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ آج اسلام کے آفاقی پیغام کی چھاپ زندگی کے تمام مظاہر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس طرح اقبالؒ "شکست کی آواز" نہیں بلکہ فتح مبیں کی صدا ہیں۔

تبصرہ نگار اختتام پر لکھتے ہیں: "اس کتاب سے علامہ اقبال اور پاکستان کے بارے میں معاصر بھارتی مسلم دانش وروں کا ذہن سمجھنے میں مدد ملتی ہے"۔ یہ رائے سراسر غلط ہے۔ مشیر الحق مرحوم اور اس قسم کے دیگر دانش وروں کی طرح اپنی تجدد پسندی کے سبب امت مسلمہ ہند میں ہمیشہ ہدف ملامت رہے ہیں۔ مشیر الحق اور ان جیسے چند بگڑے ہوئے دانش وروں کو کسی طرح بھی ہندستانی مسلمانوں کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔

رسائل و مسائل

دار الکفر میں حدود پر عمل کا مسئلہ

جنگ (لندن) کے ایڈیشن (۱۹ اپریل ۹۷) میں ایک مضمون: "برطانیہ میں سود کا لین دین اور حرام تجارت کا مسئلہ" شائع ہوا ہے جس کی فوٹو کاپی بھی آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمان پر کوئی "حد" نہیں اور اس کے لیے شراب' لاٹری' سور کے گوشت کی خرید و فروخت جائز ہے۔ اس مسئلے پر اگر آپ تفصیلی روشنی ڈال سکیں تو بہت شکرگزار ہوں گا۔ اگر دارالحرب میں مسلمان پر کوئی "حد" نہیں تو شراب پینا' زنا کرنا' چوری کرنا اور قتل کرنا کس قرآنی حکم یا حدیث کی رو سے ناجائز ہیں؟ میں انتہائی ذہنی بے سکونی کا شکار ہوں کیونکہ میں آج تک ذاتی طور پر اسے حرام سمجھتا رہا ہوں اور ایسے تمام لوگوں سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کی ہے' جو ایسی تجارت کرتے ہیں خاص طور پر اس بات سے اجتناب کیا ہے کہ ان کے گھر سے کھانا کھاؤں۔ اگر واقعی اسلام کی رو سے حقیقی طور پر ایسا نہیں ہے تو میں بڑا طویل عرصہ شدید غلطی پر رہا ہوں۔ اس پریشان کن مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔

گرامی نامہ مذکورہ فوٹوکاپی کے ساتھ ملا۔ بقول مضمون نگار' "برطانیہ میں سودی لین دین اور اسی نوع کے دوسرے حرام کام شرعاً جائز ہیں"۔ مضمون نگار نے اس کے لیے بعض فقہی کتب کے حوالے بھی پیش کیے ہیں جو دراصل غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ فقہا نے دارالحرب یا دارالکفر اور دارالاسلام کا جو فرق بیان کیا ہے اس پر وہ شخص جو معمولی سمجھ بھی رکھتا ہو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو حکومتوں کا معاملہ ہے۔ یعنی ہر حکومت اپنے دائرہ اختیار میں کام کرے گی۔ دارالاسلام کی حکومت اپنے دائرہ اختیار میں اسلام نافذ کرنے کی ذمے دار ہے جس طرح دارالکفر یا دارالحرب کی حکومت اپنے زیر اقتدار علاقوں میں اپنی مرضی کا قانون جاری کرے گی۔ دارالاسلام کی حکومت' دارالحرب میں مقیم مسلمانوں کے تجارتی معاملات کی' سودی ہوں یا غیر سودی' صحیح ہوں یا فاسد و باطل' ذمے دار نہ ہو گی جس طرح وہ ان کی نمازوں' روزوں اور دیگر عبادت کی ذمے دار نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی مسلمانوں پر دارالحرب میں کوئی پابندیاں عائد نہیں ہیں۔ دارالحرب کا مسلمان پورے کے پورے اسلام کا پابند ہے جس طرح کہ دارالاسلام کا مسلمان' اور اسی لیے حکم یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان دارالحرب میں اسلام پر عمل نہیں کر سکتا تو وہ دارالاسلام کی طرف ہجرت کرے۔ اسلامی احکام کے پابند ہونے کی بنیاد تو کلمہ طیبہ ہے۔ جب ایک انسان اس کلمے کا اقرار

کر لیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قبول کر لیتا ہے۔ مسلمانوں کا ایک عام بچہ بھی جانتا ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کو قبول کرنے کا نام ہے' ایمان مجمل اور ایمان مفصل ہر بچے کو یاد ہوتا ہے۔

مسلمان کا کام یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے اور حکومت الہیہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اسلام اور مسلمان تو کفر کے اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتا' وہ دارالحرب یا دارالکفر کے لیے اسلام کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ دارالکفر اور دارالحرب کو چھوڑ دے لیکن اگر وہ شعوری مسلمان ہے تو پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اسلام پر عمل کرنے کو چھوڑ دے اور دارالکفر کو اسلام پر ترجیح دے۔ یہ نظریے تو حکومت الہیہ اور اسلامی اقتدار کے نظریے سے متصادم ہے اور یہ وہی لوگ پیش کرتے ہیں جن کے نزدیک اسلامی اقتدار یا حکومت الہیہ قائم کرنا ایک دینی اور اسلامی فریضہ نہیں ہے۔ اس کی بجائے وہ مسلم قومیت کی حکومت کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ جہاد کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی حالت پر انتہائی افسوس ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے دارالحرب میں اسلام کو ضروری نہیں سمجھتے درآں حالیکہ قرآن و سنت' کفار کے لیے بھی اسلام کو ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام کی رو سے کفار جہاں اس بات کے مکلف ہیں کہ وہ اسلام لائیں وہیں اس بات کے بھی پابند ہیں کہ وہ شریعت پر عمل کریں۔ ان کی عبادات تو بغیر ایمان کے معتبر نہیں لیکن اگر وہ شریعت کے باقی شعبوں' معاشیات' عقوبات' سیاسیات' معاشرت وغیرہ پر عمل کریں تو ان کے یہ اعمال معتبر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ اے دنیا بھر کے انسانو' اپنے رب کی اطاعت کرو۔ اصول فقہ کی کتب میں باقاعدہ یہ ضابطہ لکھا ہوا ہے کہ کفار مخاطب "بالفروع" ہیں۔ فروع شریعت سے مراد عبادات' نماز' روزہ' حج' زکوۃ اور دیگر تمام احکام شرعیہ ہیں۔ کفار سے قیامت کے روز اس بات کا الگ حساب ہو گا کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے اور اس بات پر الگ سے باز پرس ہو گی کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین پر کیوں عمل نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز جب کافروں سے سوال ہو گا کہ انھیں دوزخ میں کون سی چیز لے گئی تو وہ جواب میں کہیں گے: قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ - وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ - وَکُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِیْنَ وَکُنَّا نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ - حَتّٰٓی اَتٰنَا الْیَقِیْنُ -(المدثر ۷۴: ۴۳-۴۷) "وہ کہیں گے: ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے' اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے' اور حق کے خلاف باتیں بنانے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے' اور روز جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے' یہاں تک کہ ہمیں اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا"۔ اسی اصول کی رو سے کفار دوہرے مجرم ہیں۔ کفر کا ارتکاب کرنے کے اور اللہ تعالیٰ کے قانون کو چھوڑ کر خواہشات نفس کی پیروی کرنے کے۔

تعجب ہے مضمون نگار اور اسی قسم کے لوگوں پر کہ وہ کفار کو اسلام چھوڑنے' سود' جوا' زنا' فحاشی' عریانی اور حدود اللہ کو توڑنے پر ملامت کرنے کے بجائے مسلمانوں کو ملامت کر رہے ہیں کہ وہ دارالحرب میں اسلام

پر عمل پیرا ہونے پر کیوں اصرار کرتے ہیں۔ ان حضرات کے نظریے کو مانا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کفار شریعت کے پابند نہیں ہیں تو ان کے خلاف جہاد کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا جہاد انھیں بزور مسلمان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے؟ جواب نفی میں ہے۔ تاریخ بھی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی بھی کفار کو بزور کلمہ نہیں پڑھایا اور انھیں تلواروں کے زور سے مسلمان نہیں کیا تو پھر جہاد کس لیے ہے؟ جواب یہ ہے کہ جہاد کافرانہ نظام کو ختم کر کے اسلامی نظام اور کفار کی حکومت ختم کر کے اسلام کی حکومت قائم کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کو کافر رہنے کا حق ہے لیکن انھیں کافرانہ نظام کو قائم رکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب کافرانہ نظام کے لیے اقتدار جائز نہیں تو اس نظام کے علم برداروں کے لیے بھی اقتدار جائز نہیں ہو گا۔ پس اقتدار اسلام اور اسلامی نظام کے لیے اور اس کے علم بردار اہل ایمان اور اہل اسلام کے لیے ہے۔ اب سود کے مسئلہ کو لیجیے: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر اور پھر حجتہ الوداع کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ ربا الجاهلية موضوع تحت قدمي و اول ربا اضعها ربا العباس "جاہلیت کا سود میرے قدموں کے نیچے ہے اور سب سے پہلے جس سود کو میں ختم کرتا ہوں وہ عباس کا سود ہے"۔ یہ وہ سود تھا جو سود کا حکم نازل ہونے سے پہلے جاہلیت میں لیا گیا تھا لیکن اس کی وصولی نہ ہوئی تھی۔ سود کی حرمت نازل ہونے کے بعد تمام سودی کاروبار یکسر ختم ہو گیا اور کسی مسلمان نے کوئی سودی کاروبار نہیں کیا اور پہلے کا جو سودی کاروبار تھا اس کے بارے میں قرآن پاک کا یہ حکم آگیا: "ایمان والو' اللہ کی نافرمانی سے بچو اور چھوڑ دو باقی ماندہ سود کو اگر تم ایمان لانے والے ہو"۔ (البقرہ ۲:۲۷۸) پھر فرمایا "اگر تم باز نہ آئے تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ کرو۔ اور اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لیے تمھارا اصل سرمایہ ہے۔ نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے"۔ (البقرہ ۲:۲۷۹) ان آیات سے جاہلیت میں طے کیے گئے سودی منافع جو دراصل دارالحرب والوں کے ساتھ کیے گئے سودی منافع تھے' حرام قرار دے دیے گئے اور ان کا لین دین ممنوع کر دیا گیا اور عملاً بھی ایسا ہی ہوا۔ کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے اس آیت کے بعد سودی منافع لیا ہو۔ اس کے بعد کسی کے لیے اس بات کی کیا گنجایش رہ جاتی ہے کہ وہ دارالحرب میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کے لیے سودی لین دین کو جائز قرار دے۔ ان آیات میں اسی دارالحرب کے سود کو حرام قرار دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے لیے کفار کے ساتھ طے کیے گئے سودی منافع لینے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا دارالحرب کے کفار کے ساتھ مسلمانوں کا سودی لین دین ان نصوص کی رو سے حرام ہے۔ اس کے بعد جو بھی برطانیہ کے مسلمانوں کے لیے سودی لین دین کو جائز قرار دے' وہ ان آیات صریحہ' قطعیہ کی مخالفت کرے گا اور نص کے خلاف اپنی رائے کو اپنا دستور العمل بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شریعت کو سمجھنے اور اسے اپنانے کی توفیق سے نوازے۔ آمین (عبدالمالک)

کتاب نما

پاکستان مسلم لیگ کا دور حکومت (۵۴-۱۹۴۷)' ڈاکٹر صفدر محمود۔ ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز' لوئر مال' لاہور۔ صفحات: ۴۰۳ (مع اشاریہ)۔ قیمت: ۱۶۰ روپے۔

مملکت خداداد نصف صدی کا سفر طے کر چکی ہے۔ اس موقع پر پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ کے مدوجزر' اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا جائزہ لینا خود احتسابی کے نقطہ نظر سے ضروری ہے۔ ہمیں ذرا رک کر دیکھنا چاہیے کہ ایک زبردست عوامی تحریک کے بل بوتے پر معرض وجود میں آنے والی مملکت پاکستان کے ساتھ مشرقی بازو کی علاحدگی کا المیہ کیوں پیش آیا اور اب ایک مستقل سوالیہ نشان کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے کہ "اس ملک کا مستقبل کیا ہے؟" ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی آجائے تو وطن کے ہمدردوں میں تشویش و اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وطن عزیز کے بارے میں منفی جذبات رکھنے والے خوشی اور مسرت سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اس سوال کا جواب متعین کرنے کے لیے' پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کے دور حکومت کا مطالعہ اور تجزیہ کیے بغیر بات سمجھ نہیں آ سکتی۔

قیام پاکستان کے تقریباً پچیس برس بعد (موجودہ سیکرٹری تعلیم) جناب صفدر محمود نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے "پاکستان مسلم لیگ کا دور حکومت (۷-۱۹۴-۱۹۵۴)" میں اس المیے کی وجوہ تلاش کرنے کی کوشش کی تھی' یہ مقالہ اس وقت کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور اتفاق سے آج پھر مسلم لیگ برسراقتدار ہے۔

ڈاکٹر صفدر محمود کہتے ہیں: "پاکستان کا اصل مسئلہ معاشی وسائل کی قلت نہیں' بلکہ سیاسی قیادت کا قحط ہے۔ مسلم لیگ کا دور حکومت بھی اسی سانحے کا نوحہ ہے" (ص ۷)۔ مسلم لیگ کی قیادت قائداعظم جیسے عظیم قانون دان کے ہاتھ میں رہی' مگر ان کے انتقال کے بعد لیگ لاقانونیت کے راستے پر چل نکلی۔ اب جو پارٹی اپنے داخلی نظم و ضبط کے لیے اپنے دستور کا احترام نہ کرے گی' وہ بھلا ملکی اور رواجی آئین و دستور کو کیوں پرکاہ کی حیثیت دے گی۔ دستور کے مطابق لیگ کی (مرکزی) کونسل کا اجلاس سال میں دو مرتبہ ہونا چاہیے تھا' لیکن "دستور کی باقی شقوں کے مانند اس شق پر بھی عمل نہ کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر ۴۸ سے ۵۴ تک کونسل کے صرف سات اجلاس ہوئے" (ص ۱۷)۔ آج اگر مسلم لیگ کے قائدین اپنے جماعتی دستور کے وجود سے بے خبر ہیں' تو اس مرض کی جڑیں ماضی میں تلاش کرنی چاہییں۔ آج پارٹی کے اندر آمرانہ

سوچ اور شاہانہ پسند و ناپسند سکہ رائج الوقت ہے۔

صفدر محمود لکھتے ہیں: "مسلم لیگ کو یہ منفرد شرف حاصل ہوا کہ' اسلامی مملکت کا جو نعرہ اس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوا' صرف اسی کو کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ "اسلام" کا لفظ ہی تھا' جس نے ہند کے مسلمانوں کو اتحاد کے جذبے سے سرشار کر دیا" (ص ۳۴۹) مگر پھر اپنے وعدوں اور دعوؤں کے مطابق: "پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا تو الگ' مسلم لیگ عوام کے بنیادی مسائل بھی حل نہ کر سکی" (ص ۲۸۵)۔

مسلم لیگ نے مختلف اوقات میں انقلابی نعروں کو اپنایا: "صوبائی مسلم لیگیں جاگیرداری کے خاتمے اور صوبائی خود مختاری کے لیے آئے دن قراردادیں منظور کرتی رہتی تھیں... (لیکن) مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کی نااہلی اور نا سمجھی کے سبب ان دونوں مطالبوں کا بروقت علاج نہ کیا گیا" (ص ۲۲۴)۔ "مسلم لیگ اور اس کے قائدین' زرعی اصلاحات کے وعدے کرتے رہے' لیکن جب ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا وقت آیا تو لیگ کی قیادت کے لیے وعدے نبھانے مشکل ہو گئے" (ص ۲۸۱)۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کیا آج بھی لیگ انھی طبقوں کا ایک مقتدر ادارہ نہیں ہے؟ پھر "مسلم لیگ' آہستہ آہستہ بڑے زمین داروں اور کاروباری سیٹھوں کا ایک ادارہ بن کر رہ گئی" (ص ۳۶۱)۔ وہ کہتے ہیں: "لیگ کے لیڈر یہ اعلان اور دعویٰ تو بڑے زور شور سے کرتے تھے کہ صرف لیگ ہی قومی مسائل حل کر سکتی ہے' لیکن انھیں اس حقیقت کا احساس کرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی کہ آخر لوگ کب تک کھوکھلے نعروں سے مطمئن رہیں گے...... مسلم لیگ سے عوام کی توقعات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگیں' اور مایوسی و اضطراب نے ایک لہر کی شکل اختیار کر لی۔ وقت کا کاروان چلتا رہا' اور مسلم لیگ پیچھے رہ گئی" (ص ۳۳۹)۔ مسلم لیگ کے مداح اخبار کو بھی یہ لکھنا پڑا: "مسلم لیگ کی سیاست بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی حیثیت اب ایک ایسے کارواں کی ہے' جس کے پیش نظر کوئی منزل نہ ہو۔ لیگ نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا" (اداریہ بحوالہ کتاب مذکور' ص ۳۳۸)

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ قاری کے لیے پریشان کن ہے۔ مسلم لیگ کی تاریخ اس کے لیڈروں اور کارکنوں (الا ماشاء اللہ) کی مفاد پرستیوں' باہمی انتشار' ہوس اقتدار' دھڑے بندیوں' اقربا پروریوں' سازشوں' غیر جمہوری رویوں' عاقبت نااندیشیوں اور بحیثیت مجموعی "پستی کردار" (ڈاکٹر صفدر محمود' ص ۸۱) کی عبرت ناک داستان ہے۔ انجام کار: "جس تنظیم نے انگریزوں اور ہندوؤں سے مسلمانوں کے لیے حق خود ارادیت بزور بازو چھینا تھا' وہ پاکستان کے قیام کے بعد اس ملک کو آمریت و استبداد سے بچانے کے معاملے میں بالکل بے بس ثابت ہوئی" (ص ۳۶۳)۔ کتاب میں یہ آخری سطور' آج پاکستان کے دستور میں اوپر تلے ہونے والی ترامیم کو ایک طرح سے معنویت عطا کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر صفدر محمود کی اس کتاب کا مطالعہ جس قدر آج ضروری ہے' اتنا شاید پہلے کبھی نہیں تھا۔ ہم مسلم لیگ کے رہنماؤں اور حامیوں سے دردمندانہ گزارش کریں گے کہ وہ اس کتاب کا بہ غور مطالعہ کر کے بقول ڈاکٹر صفدر محمود: "اس آئینہ تحریر میں اپنے ماضی کی جھلک دیکھیں اور مستقبل کو سنوارنے کی فکر کریں" (ص ۹)۔

کاش ہمارے ہاں اس طرح کے زندہ موضوعات پر تحقیق کی روایت جڑ پکڑ سکے۔ (سلیم منصور خالد)

تحریک پاکستان اور صحافت، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔ ناشر: بولان بک کارپوریشن، کوئٹہ۔ صفحات: ۳۸۶۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔

قیام پاکستان اس صدی کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ برعظیم کے وہ مسلمان جنھیں پاکستان کی آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع ملا بہ وجوہ اس کی اہمیت سے آشنا نہیں ہو سکے۔ نتیجہ یہ کہ پاکستان اپنے ایک بازو سے محروم ہو گیا اور اس وقت گوناگوں مسائل سے دوچار ہے۔ اس عالم میں حکومتی سطح پر پاکستان کی گولڈن جوبلی منانے کا اعلان کیا گیا ہے جو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اس شعر کی روشنی میں گولڈن جوبلی کی بجائے اگر خود احتسابی کی طرح ڈالی جاتی تو یقیناً اس سے ہمیں کچھ فوائد حاصل ہوتے۔ بہرحال گولڈن جوبلی کے اعلان سے یہ ضرور ہوا ہے کہ اہل دانش و بینش حرکت میں آئے ہیں اور انھوں نے تحریک پاکستان کی مقصدیت کو اجاگر کرنے اور اہل پاکستان میں جذبہ حریت کو بیدار رکھنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے۔ اس کے مصنف، پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر پاکستان کے صف اول کے اہل قلم ہیں اور اپنی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر معروف ہیں۔ انھوں نے اپنی نگارشات کی بدولت پاکستان کے علمی اثاثے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان نہ تو صرف قائداعظم کی کوششوں کا ثمر تھا اور نہ محض مسلم لیگ کی مساعی کا نتیجہ بلکہ اس منزل کے حصول کے لیے ملت اسلامیہ کے جملہ طبقے مثلاً علما' ادبا' شعرا' صوفیا' سیاست دان' طلبا و طالبات اور خواتین وغیرہ سرگرم عمل تھے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے زیر نظر کتاب میں تحریک پاکستان کے حوالے سے نہ صرف پاکستان کے مختلف علاقوں کے اخبارات و جرائد کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ قرارداد لاہور کے مقاصد کو متعارف کرانے کے سلسلے میں ملت اسلامیہ کے مختلف طبقات کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ یہ روداد دلچسپ ہے' معلومات افزا اور جذبہ انگیز بھی۔ یہ کتاب اگرچہ ہمارے ماضی

آئینہ ہے لیکن اس کی بدولت حال کے حقائق کا جائزہ لینے کی امنگ بھی پیدا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کوثر نے اکثر و بیشتر صورتوں میں بنیادی ماخذ پر انحصار کیا ہے اور تحقیق کے دیگر تقاضے بھی ملحوظ رکھے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ماخذ کی فہرست بھی دی ہے۔ اس طرح کتاب حقائق کا ایک مستند ذخیرہ بن گئی ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ عمدہ ہے لیکن غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو پروف ریڈنگ کی کوتاہی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں' مثلاً "مندرجات" میں چوتھے باب کا ایک ذیلی عنوان یوں درج کیا گیا ہے: "پاکستان کی ناگزیریت" جب کہ ص ۳۷۷ پر اس کو بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے نہ کہ باب کے ذیلی حصے کے طور پر اور ایک عنوان یوں دیا گیا ہے: "پاکستان کی ناگزیریت نقار خانہ میں"۔ اسی طرح خواجہ ظفر نظامی کی تیار کردہ تحریک پاکستان کے حامی ۱۳۱ اخبارات و جرائد کی فہرست میں بھی کمپوزنگ کی غلطیاں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر انعام الحق کوثر کو داد دینا پڑتی ہے کہ انھوں نے تحریک پاکستان کے نشیب و فراز کو اجاگر کرنے کی کامیاب سعی کی ہے اور مسلمانان برعظیم کی جدوجہد آزادی سے متعلق ایسے اوراق گم گشتہ کو جمع کر دیا ہے جو یقیناً چشم کشا اور بصیرت افروز ہیں۔ امید ہے کہ دوسرے اہل قلم بھی ان کی پیروی کریں گے۔ (ڈاکٹر رحیم بخش شاھین)

تحدیث نعمت' مولانا محمد منظور نعمانی۔ مرتبہ: عتیق الرحمن سنبھلی نعمانی۔ ناشر: الفرقان بک ڈپو' ۳۱/۱۱۴ نظیر آباد' لکھنؤ ۱۸۔ صفحات: ۳۵۲۔ قیمت: ۷۵ روپے۔

برعظیم پاکستان و بھارت کے نامور عالم اور مصنف مولانا محمد منظور نعمانی (وفات: ۴ مئی ۱۹۹۷) نے تقریباً ربع صدی قبل' اپنے مجلے "الفرقان" میں "تحدیث نعمت" کے عنوان سے بعض دینی شخصیات پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ مرحوم کے لائق فرزند' عتیق الرحمٰن صاحب نے مذکورہ سلسلہ مضامین کو' اپنے والد ماجد کے ایما پر اور انھی کی نگرانی میں "الفرقان" میں مطبوعہ بعض دیگر تحریروں کی مدد سے' اضافوں کے ساتھ زیر نظر کتاب کی صورت میں مرتب و مدون کر دیا ہے۔

کتاب کا حصہ اول (ص ۱۳ تا ۱۱۸) مصنف کی خود نوشت سوانح عمری پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصے بہت دلچسپ ہیں' مثلاً لکھتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سلسلہ مضامین "الجہاد فی الاسلام" نے اس عاجز کو متاثر کیا۔ "جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں' میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا۔ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی"---- مگر یہ اقدام "فکر و نظر کی ایک غلطی" تھا (ص ۹۷)۔ چنانچہ مولانا نعمانی جماعت سے الگ ہو گئے---- اس ضمن میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ علاحدگی میں مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے ایک رفیق خاص' حاجی عبدالرحمٰن نومسلم کے "روحانی تصرف" کا دخل تھا۔ حاجی صاحب کے بارے میں مشہور تھا

کہ وہ مستجاب الدعوات ہیں۔ جن دنوں مولانا منظور نعمانی، جماعت اسلامی کے اساسی رکن کی حیثیت سے مرکز جماعت دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ میں مقیم تھے، انھی دنوں ایک دوپہر، وہاں سے بہت دور، مولانا محمد الیاسؒ نے، حاجی صاحب کو نیند سے جگا کر فرمایا کہ: وہ (نعمانی صاحب) ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت ان کے لیے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے۔ پھر دونوں بزرگوں نے حجرے میں جا کر دو رکعت نماز کے بعد دعا مانگی--- نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ جماعت سے میری علاحدگی کے کچھ ظاہری اسباب و وجوہ بھی تھے، لیکن حاجی عبدالرحمٰن صاحب سے مذکورہ بالا واقعہ سن کر دل میں یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اس قلبی کیفیت اور اندرونی کش مکش میں اصل عامل ان دونوں بزرگوں کی یہ دعا تھی (ص ۲۰۵ تا ۲۰۷)۔

ڈاکٹر سید محمود کے ذکر میں ایک جگہ نعمانی صاحب نے لکھا ہے: "مسلمان قوم میں اجتماعی کاموں کی صلاحیت ایک عرصہ دراز سے مفقود ہے چنانچہ اس تجربے (مسلم مجلس مشاورت ۱۹۶۴) کے بعد کسی نئے اجتماعی کام میں اپنا وقت صرف کرنے کی ہمت نہ رہی۔ بس جو کچھ انفرادی طور پر ہو سکے، اسی کے لیے اپنے آپ کو مکلف سمجھ لیا"۔ (ص ۹۵)--- اس تاثر سے مولانا مرحوم کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ متعدد بزرگوں، مشاہیر اور علماے کرام کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاسؒ، مولانا حسین علیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد زکریاؒ اور مولانا عبدالقادر راے پوریؒ وغیرہ--- ان مختصر تذکروں سے مذکورہ مشاہیر، علم و عمل اور اخلاق و کردار کے مجسموں کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ ان تذکروں میں تاریخ و سیاست کے نشیب و فراز کی کہانی بھی آگئی ہے--- بحیثیت مجموعی مولانا کی تحریر میں ایک خاص طرح کا خلوص، رقت قلبی اور بزرگوں سے خوش عقیدگی نمایاں ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

آسمان علم کے درخشندہ ستارے، سید نظر زیدی۔ ناشر: حرا پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۲۱۰۔ قیمت: ۴۵ روپے۔

اسوۂ رسولؐ کی روشنی تو ہر زمانے میں نور ہدایت رہی اور رہے گی، مگر اس کے علاوہ بھی انسان رشد و ہدایت کی ضرورت سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ ہر دور کی ضرورت نے اسے مثالی ہستیوں کی تلاش پر مجبور کیا ہے جو اس کی راہنمائی کر سکیں۔ اس سلسلے میں نظر زیدی صاحب نے امام ابو حنیفہ، امام غزالی، سعدی شیرازی، شاہ رکن الدین ملتانی، ملا عبدالقادر بدایونی، مجدد الف ثانی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید، محمد قاسم نانوتوی، سرسید احمد خان، اکبر الہ آبادی، محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی کا ایک عمدہ تذکرہ مرتب کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اکابر نے اپنے وقت کے سیاسی اتار چڑھاؤ

اور اصلاح احوال میں بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ اگرچہ مصنف نے مذکورہ شخصیات کا شخصی تعارف اور خاندان کی تفصیل بھی دی ہے مگر اصلاح امت کے لیے ان کی سیاسی، ادبی، سماجی اور اصلاحی خدمات کا تذکرہ زیادہ اہم ہے۔ زیر نظر کتاب کی نمایاں خوبی اختصار اور جامعیت ہے۔ اس سے مذکورہ شخصیات کا نہ صرف عمومی تعارف ہو جاتا ہے بلکہ ان کے کارناموں سے بھی بخوبی آگاہی ہوتی ہے۔ جس واقعے، یا تربیت کے جس رخ نے کسی شخص کو بڑا آدمی بنانے میں خاص کردار ادا کیا، جناب نظر زیدی نے اس کو نمایاں کر دیا ہے۔ ماؤں کی تربیت، علم سے شغف، اسلام کی جانب طبعی میلان اور مسلمانوں کی حالت زار کے گہرا احساس جیسے مظاہر ایسے ہیں جنھوں نے ان کو تاریخ میں ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ نظر زیدی نے محض بیانیہ انداز میں تاریخ نہیں لکھی بلکہ مختلف افراد کی کوششوں کے اثرات و نتائج سے بھی بحث کی ہے۔ مصنف نے مباحث کے بہت سے ذیلی عنوانات قائم کیے ہیں مگر ان میں یکسانیت نہیں ہے اور ترتیب بدل بھی گئی ہے۔ بہرحال کتاب کی مقصدیت اور افادیت میں کلام نہیں۔ (زبیدہ جبیں)

مجلہ **التجدید** (سہ ماہی)، شمارہ: جنوری ۱۹۹۷۔ تقسیم کنندگان: المرکز الدولی للخدمات الثقافیہ، ص ـ ب ۱۳۵۲۴۲۔ بیروت، لبنان۔

گذشتہ دہائی میں برادر ملک ملائیشیا نے جس تیزی سے صنعتی و مادی میدانوں میں ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ اس نے خصوصاً ترقی پذیر قوموں کو حیرت میں ڈال دیا ہے اور ملائیشیا میں یہ ترقی صرف مادی پہلو تک محدود نہیں ہے بلکہ یہاں کی اسلامی تحریک بھی روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت وقت اور اس کے درمیان مفاہمت کے ماحول نے ملک کی تعمیر کو مزید آسان بنا دیا ہے۔ ۱۹۸۳ سے قائم یہاں کی عالمی اسلامی یونی ورسٹی نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے اور جدید و قدیم کے تقاضوں کی روشنی میں اسلام کو سمجھنے والے بہت سے ماہر یہاں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں۔

یہاں سے متعدد انگریزی معیاری مجلات کے ساتھ "التجدید" کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ عربی زبان میں نکل رہا ہے۔ تازہ شمارے کا اداریہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالحمید احمد ابو سلیمان نے تحریر کیا ہے جو ایک عرصے تک امریکہ میں قائم ایک معروف علمی و تحقیقی ادارے **المعهد العالمی للفکر الاسلامی** کے صدر رہ چکے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ اس ادارے کی روح اس یونی ورسٹی میں بھی پھونکنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اداریے میں بتایا گیا ہے کہ یونی ورسٹی اور مجلے کا اصل مقصد علم و عرفان کو اسلامی بنانا اور ایک ایسی زندہ اسلامی فکر کو پروان چڑھانا ہے جو زمانے کا ساتھ دے سکے اور عصر حاضر کے مطالبات اور چیلنجوں کا جواب ایک بہتر و بلند سطح سے دے سکے۔ مجلے میں متعدد موضوعات پر بلند پایہ

علمی مقالات شامل ہیں، مثلاً ڈاکٹر عبدالحمید فتاح کا مقالہ: "قرآن مجید اور اس کا سائنٹفک انداز فکر"، ڈاکٹر محمد کمال کا مقالہ: "ملایا میں اسلام"۔ ڈاکٹر محمود الزواوی نے اپنے مقالے میں جدت پسندی کے میدان میں علامہ ابن خلدون کے قائدانہ کردار اور علم جدید پر بحث کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمجید النجار کا مقالہ تہذیبی پس ماندگی اور فقہ اسلامی سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن عزمی نے تہذیب و ثقافت پر تصویری میڈیا کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ بعض علمی تصانیف اور ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالوں پر تبصروں کے علاوہ "عربی زبان کے مسائل اور اکیسویں صدی کے چیلنج" اور "جاپان، اسلام اور مغربی ممالک" جیسے موضوعات پر دو بین الاقوامی کانفرنسوں کی روداد بھی شامل ہے۔

مجلہ عمومی طور پر دقیق علمی بحثوں پر مشتمل ہے۔ امید ہے علمی حلقوں میں مشرق بعید سے آنے والے اس مجلّے کی خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔ (عبدالمتین منیری)

افکار ملی، (ماہنامہ)، مسلم معاشرہ نمبر، مدیر: سید قاسم رسول الیاس، مقام اشاعت: ای ۲۲/۱۵۳، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔ صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۳۵ روپے۔

بھارت کا مسلم معاشرہ ۱۲ کروڑ انسانوں کا معاشرہ ہے اور اپنی تاریخ، حالات اور عوامل کی وجہ سے خصوصی مسائل سے دوچار ہے۔ "افکار ملی" دہلی کا یہ نمبر "ہندستانی مسلم معاشرہ: ماہیت، مسائل، امکانات" کے حوالے سے ایک نہایت غیر معمولی، وقیع اور قابل قدر کاوش ہے۔ بلاشبہ یہ نمبر، ایک جامع دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور مسائل کا حقیقی فہم عطا کرنے کے ساتھ ساتھ راہیں کھولنے والا بھی ہے۔ مرض کی نشاندہی کرتا ہے تو علاج بھی بتاتا ہے۔ پہلے حصے میں اسلامی معاشرے کے حوالے سے اصولی مباحث ہیں۔ دوسرے حصے: "ماہیت" میں موجودہ معاشرے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور سات مقالات میں معاشرے پر ہندو دھرم کے اثرات، مغرب کے اثرات، خواندگی کی صورت حال اور خواتین کی پوزیشن کو پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے: "مسائل اور امکانات" میں ۴۷ مقالات ہیں۔ بھارت کے معروف قائدین اور اہل قلم نے یہ قیمتی مباحث علمی اور تعمیری انداز سے پیش کیے ہیں۔ شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو۔ (مسلم صحافت کے جائزے کی کمی محسوس ہوتی ہے) خواتین کے مسائل کو جائز طور پر خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور مختلف زاویوں سے ۸ مقالات ان کا احاطہ کرتے ہیں۔ بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں کے مسائل کو الگ الگ زیر بحث لایا گیا ہے۔ رہائشی مسائل، رسوم و رواج، برادری اور ذات پات، بخل و اسراف، گداگری جیسے مسائل پر عملی انداز سے گفتگو کی گئی ہے۔ نیز پرسنل لا، یکساں سول کوڈ، دار القضا کا قیام اور نظام زکوٰۃ پر تحریرات شامل اشاعت ہیں۔ معاشرتی بگاڑ کے عوامل، اصلاح معاشرہ کیوں اور کیسے مسلم قیادت کے مسائل کے

ذریعے راہ عمل واضح کی گئی ہے۔ معاشرہ اور اردو ادب اور اسلام اور تفریحات کا موضوع بھی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ ۲۴۰ صفحات کا یہ نمبر بھارت کے مسلمانوں کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنی حقیقی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی مطالعے بیداری پیدا کرتے ہیں اور عمل پر ابھارتے ہیں۔ لکھنے والوں میں سید جلال الدین عمری، سلطان احمد اصلاحی، فضل الرحمٰن فریدی، وحید الدین خاں، خالد سیف اللہ رحمانی، ڈاکٹر ابن فرید، مولانا سلیمان قاسمی، ڈاکٹر احمد سجاد اور بہت سے دوسرے شامل ہیں۔ ہمارے ملک میں معاشرتی مسائل پر اخبارات میں مضامین آتے رہتے ہیں لیکن اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی ادارہ اسی انداز سے جامع مطالعے کا اہتمام کرے، اور پچاس سالہ تاریخ کے تناظر میں دیکھے کہ پاکستانی مسلم معاشرہ کے، سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کے پہاڑوں اور میدانوں میں رہنے والے ۱۲ کروڑ مرد، عورتیں، نوجوان، بوڑھے اور بچے کن مسائل کا شکار ہیں اور ان کے حل کے لیے کیا کیا جا رہا ہے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ "افکار ملی" پابندی سے شائع ہونے والا ماہنامہ ہے اور اپنے دائرہ کار میں مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ (مسلم سجاد)

The Newsletter (ماہنامہ) (رابطہ: سیف اللہ خالد)۔ پوسٹ بکس ۹۵ ۷، چٹاگانگ، بنگلہ دیش۔

آج ملت اسلامیہ کا حال دیکھیں تو مسلم ممالک آزادی کا دم بھرنے کے باوجود اقتدار اعلیٰ سے محروم اور دوسروں کی دھونس کے سامنے مجبور نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو مسلم حکمران آنکھیں چرانے میں سبقت لے جاتے ہیں۔

برما، اسی برعظیم کے ایک کونے پر واقع ہے۔ وہاں کے فوجی حکمران یوں تو بدھ مت کے پیروکار ہیں مگر برمی مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ ان مظلوم برمی مسلمانوں کی جدوجہد کی علم بردار تنظیم "روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن اراکان" گذشتہ کئی برسوں سے اپنے دکھ، کرب اور کیفیت کو مقدور بھر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ یہ ماہانہ خبرنامہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

برما کے مسلمانوں پر گزرنے والی قیامت کی کچھ جھلکیاں، شب تار کی کچھ چیخیں، اور چند آہیں اس ذریعے سے مل جاتی ہیں، افسوس اور مغربی دنیا اور خود پاکستان کا پریس اس سے بے نیاز ہے۔ اراکانی مسلمان اپنی جدوجہد سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عطیات کے مستحق ہیں۔ پاکستان میں ان کا رابطہ نمبر پوسٹ بکس ۵۹۱، کراچی ۷۴۲۰۰ ہے۔ (س۔م۔خ)

گذشتہ ماہ "کتاب نما" میں تفہیم القرآن کے جس فارسی ترجمے پر تبصرہ شائع ہوا تھا، اسے: دارالعروبہ، منصورہ، لاہور ۔۱۸ نے شائع کیا ہے۔ (ادارہ)

مدیر کے نام

عبدالمتین منیری، دبئ

ڈاکٹر ممتاز احمد کا مضمون: "اسلامی تحریکیں اور حزب اختلاف کا کردار" (جون ۹۷) بہت ہی پیارا تھا۔ اسلامی تحریکوں کے انداز فکر اور طریق کار پر باریک بینی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ عشرے میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ وہابی تحریک کے ابتدائی قائدین سلیمان بن عبدالوہاب، حسن بن محمد عبدالوہاب وغیرہ سے بہت متاثر ہے۔ شیخ عبداللہ بن ابراہیم کے فتاویٰ اور علماے نجد کے رسائل الدررالسنیہ انھیں بنیادی غذا فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر سلفی تحریک ہے، لیکن شاہ پرست نہیں۔ الجزائر کی ایف آئی ایس اور کویت کے سلفی اس سے متاثر ہیں۔ صومالیہ میں اس کی جڑیں مضبوط ہو گئی ہیں۔ ابھی اردو داں طبقہ ان سے زیادہ واقف نہیں ہے۔ ڈاکٹر ممتاز نے الجزائر میں محفوظ نحناح کی جماعت کا تذکرہ نہیں کیا۔ الجزائر میں ایف آئی ایس کا غلبہ ہے لیکن نحناح کی جماعت معتدل سمجھی جاتی ہے۔ اخوان المسلمین اس جماعت کو اپنا ترجمان سمجھتی ہے۔ اس کا حکمرانوں سے سمجھوتہ ہوا ہے اور اس نے انتخابات میں حصہ لیا ہے۔ اس کا ذکر آنا ضروری تھا۔

افتخار عارف، صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

ماہنامہ ترجمان القرآن سے حسب توفیق استفادہ کرتا رہتا ہوں۔ خداوند کریم توفیقات ارزانی کرے۔ مولانا گوہر رحمٰن کا خط (جولائی ۹۷) بلامتن ترجمہ قرآن کی اشاعت کے سلسلے میں دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اوائل کا زمانہ تھا۔ ای ایم آئی ریکارڈنگ کمپنی کے منتظم اعلیٰ، پطرس بخاری مرحوم کے فرزند ارجمند جناب منصور بخاری صاحب نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنی آواز میں حضرت سید ابوالاعلیٰ مودودی کا اردو ترجمہ ریکارڈ کرا دوں اور یہ کیسٹس کی شکل میں عوام کے استفادے کے لیے فراہم کیا جا سکے تو یہ ایک بڑی خدمت ہو گی۔ میں نے ان سے اتفاق کیا اور شکریہ ادا کیا کہ اس سعادت کے لیے انھوں نے مجھے منتخب فرمایا۔ اب اس کو خود غرضی کہیے کہ میرے ذہن میں بعض اچھی آوازیں اور بھی آئیں جو مجھ سے بہتر یہ کام سرانجام دے سکتی تھیں مگر میں نے ایک نوع کی خود غرضی کا مظاہرہ کیا اور ان کی تجویز پر فوری رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں نے اپنے محسن و کرم فرماؤں، استاذ مکرم سید سلیم احمد مرحوم اور مشفق و مکرم، صلاح الدین شہید کے توسط سے اپنی یہ درخواست حضرت مولانا تک پہنچائی۔ انھوں نے اس سے اتفاق کیا کہ انھیں قرآن مجید کے کیسٹوں پر منتقل کرنے سے کوئی اختلاف نہیں ہے مگر صرف ترجمہ مناسب نہیں ہے، متن کو ضرور شامل کیا جانا چاہیے۔ ای ایم آئی

نے اس خیال سے کہ اس کا حجم بڑھ جائے گا اور نتیجتاً قیمت بھی بڑھ جائے گی، اس منصوبے کو آگے نہیں بڑھایا۔ جہاں تک میرا حافظہ ساتھ دیتا ہے، مولانا مرحوم و مغفور کی طرف سے قرآن مجید کے ترجمے کی متن سے علیحدہ اشاعت کے بارے میں جو رائے آئی تھی وہ یہ تھی کہ "متن سے جدا تراجم کی روایت متن سے دوری کی بنیاد بن سکتی ہے"۔ قرآن مجید سے پہلے کے صحائف کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بعد میں مختلف مرحلوں پر قرآن حکیم کے کیسٹس مختلف قاریوں کی آوازوں میں شائع ہوئے اور مقبول بھی ہوئے مگر متن سے علیحدہ ترجمہ میرے خیال میں نشر نہیں کیا گیا۔ یہ بات کیونکہ فوری طور پر میرے ذہن میں آئی تھی، سو میں نے چاہا کہ آپ تک پہنچائی جائے۔ صاحبان علم، علمائے کرام اور فقہائے محترم ظاہر ہے بہتر سمجھتے ہیں اور وہ ان امور پر اظہار خیال فرمانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ میں نے یہ واقعہ بر سبیل روایت نقل کیا ہے۔

خالد مسعود، فیصل آباد

رسالہ خریدنے کی وجہ اس کی ظاہری چمک دمک، عمدہ ٹائٹل، عمدہ کتابت اور ایسا انداز تحریر تھا کہ میں نے فوراً ہی اپنے عزیز کے ہاتھ پر چندہ رکھ دیا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ جیسے رسالے کے چہرے پر نئے دیکھنے والے کے لیے ایک دلکش مسکان ہے، خوش آمدید لکھا ہوا ہے، آنکھوں میں بلاوے کی التجا ہے اسی طرح اس جماعت کے داخلہ گیٹ پر کوئی معصوم صورت، دل نواز مسکراہٹ والا، دل لبھانے والا، آنکھوں میں مقناطیسی کشش والا محبوب صورت بزرگ بیٹھا ہو جسے دیکھ کر مجھ جیسا بے ہمت، بے عمل مگر اچھا بننے کا تھوڑا طلب گار، اپنی کم علمی پر شرمندہ مگر مزید علم کا خواہش مند، مخصوص مولوی سے ڈرا سہا ہوا، خواہش کرے کہ اندر جھانک کر دیکھوں کہ اندر کیا ہے۔ اس دفعہ آپ کے بلکہ میرے بھی (چندہ دیا ہے، کوئی مذاق تو نہیں ہے!) ترجمان القرآن میں "پھر کیوں تم شکرگزار نہیں ہوتے" پڑھا۔ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس پر مولاناؒ کی تفصیل، رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ انسان اپنی حقیقت جان لے تو شاید یہ اپنی میں میں سے شرمندہ ہو۔

شاہد اسلام، فورٹ عباس

تین سال سے ترجمان القرآن باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ علمی اور معیاری رسالہ ہے۔ تربیت، حالات سے ہم آہنگ، اخبار امت سے مزین گویا کہ ہمہ گیریت سے لیس مجلہ ہے۔ "سستی و کاہلی" بہترین مضمون تھا۔ آپ کی اور خرم مرادؒ کی مساعی نے خوب رنگ دکھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کا اجر آپ کو دے سکتا ہے۔

محمد عاکف، لاہور

آپ انگریزی میں رسالہ نکالیں تو شوق سے جتنے انگریزی الفاظ چاہے، لکھیں۔ لیکن اردو سالے میں: derivatives, spread, methodologies, pattern؟ کیا ان کے متبادل نہیں؟ اس طرح اتھارٹی، وژن اردو داں کیسے سمجھے؟

C .P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE,